بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

شمارہ نمبر ۱۵ — ۱۰ ؍جون ۲۰۲۱ء مطابق ۲۸ ؍شوال المکرم ۱۴۴۲ھ — جلد نمبر ۵۸

اس شمارے میں

شعروادب

اثر بلالؓ کے حرفِ اذاں سے ملتا ہے! — رئیس الشاکری ندویؒ — ۴

اداریہ

اناللہ وانا الیہ راجعون — حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — ۵

چشم کشا

نسل نو کی تعلیم وتربیت کی فکر — حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ — ۹

حکمت ربانی

صبر کا مقصد اور اس کی شکلیں — ڈاکٹر یوسف القرضاوی — ۱۲

راہِ عمل

مسلمانوں کی تعلیم میں ترقی کی ضرورت — حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی — ۱۴

علم وعمل

اسلام میں تعلیم وتربیت کا مقام — مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی — ۱۷

اخلاص نیت

قدیم نظام تعلیم کی خصوصیات — مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ — ۲۱

اسوۂ حسنہ

ابلاغِ دعوت – اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں — محمد ارشاد الرحمٰن — ۲۴

تعارف وتبصرہ

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خلافت — پروفیسر محسن عثمانی ندوی — ۲۹

نبی رحمت

سیرت نبویؐ میں رحم وکرم کے نقوش — مولانا محمد طارق نعمان — ۳۱

فقہ و فتاویٰ

سوال وجواب — مفتی محمد ظفر عالم ندوی — ۳۳

سرپرست

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمود حسن حسنی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی ❀ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❀ مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرتعاون ذیل میں دیے گئے اکاونٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT
A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)
IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157
State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ای میل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER-E-HAYAT
Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406
website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/400	فی شمارہ -/20	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔ 75$

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر =/30₹ جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر اطہر حسین نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کراکے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر و ادب

اثر بلالؓ کے حرفِ اذاں سے ملتا ہے!

رئیس الشاکری ندویؒ

شرف جو نعتِ شہ انس و جاں سے ملتا ہے • خراج آج بھی دونوں جہاں سے ملتا ہے
مہ و نجوم اُجالا تو بانٹتے ہیں مگر • خبر بھی ہے کہ اُجالا کہاں سے ملتا ہے
یہ سرزمین کہ رضواں کی جنتیں بھی نثار • یہاں تو صحرا بھی باغِ جناں سے ملتا ہے
سکونِ روح کے ساماں وہیں سے ہوتے ہیں • دلوں کو چین اُسی آستاں سے ملتا ہے
خرام ناز کے روشن نشان یاد آئے • عجیب حسن، صفِ کہکشاں سے ملتا ہے
عجب نہیں کہ ٹھہر جائے وقت کی رفتار • مکاں کا حسنِ یقیں لا مکاں سے ملتا ہے
صداقتوں سے فروزاں، رفاقتوں کا خلوص • مزاج خواجۂ کون و مکاں سے ملتا ہے
وہی شفیق تبسم ، وہی کریم آنکھیں ! • جو میرا جرم بھی رحمت نشاں سے ملتا ہے
سحر نصیب پرندے جو چہچہاتے ہیں • اثر بلالؓ کے حرفِ اذاں سے ملتا ہے

رئیسؔ حضرت حسانؓ کا میں پیرو ہوں
ثبوت میرے زبان و بیاں سے ملتا ہے

☆☆☆☆☆

اداریہ

إنا لله وإنا إليه راجعون

ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نائب ناظم وناظرِ عام، معتمد مال اور عمید کلیۃ اللغۃ جوارِ رحمت میں

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ماہ رمضان المبارک اوراس کے بعد ندوہ کو کئی اہم اور کارگزار شخصیات کے حادثۂ وفات سے دوچار ہونا پڑا، اور ایک مہینہ کے مختصر عرصہ میں متعدد رفقاء کار اور ندوہ کے ذمہ دار افراد ہم سب کو چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، جن میں عزیزی وعزیز القدر **مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی** جن کو اب مرحوم لکھنا پڑ رہا ہے، وہ صرف میرے بھتیجے ہی نہیں تھے بلکہ دین وملت کے کاموں میں شریک وسہیم تھے، ان کے نہ رہنے سے دوہرا نقصان ہوا ہے لیکن سب مقدرات کے ساتھ ہوتا ہے، اس سے اپنے رب رحیم سے طلب تسکین کی جاتی ہے، دعا ہے اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمائے اوراسی سے دینی وملی نقصان کو سامنے رکھتے ہوئے دعا کی جاتی ہے کہ جو نقصان ہوا اس کی تلافی حاصل ہو اور یہ رب رحیم وکریم سے بعید نہیں۔

فی الفور ندوہ کے متعلقین ومنتسبین اور دین وملت کی خدمت سے وابستہ حضرات پر جو اثر پڑا ہے، وہ فطری ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی کرم والی ہے وہ تسکین بھی دے گی، بہتر سال کی عمر میں معمولی علالت کے بعد ۲۴/رمضان ۱۴۴۲ھ مطابق ۷/مئی ۲۰۲۱ء کو وفات پائی اور اپنے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہوئے۔

عزیز موحوم نے ماہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ (عتق من النار) کے خیر الایام جمعۃ الوداع کے آخری لمحات میں عصر ومغرب کے درمیان داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، مہینہ بھی مبارک، دن بھی بابرکت اور وقت بھی مبارک، اور پھر پچیسویں شب میں ان کی نماز جنازہ احاطہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں نماز عشاء وتراویح کے بعد مہتمم دار العلوم مولانا سعید الرحمان اعظمی ندوی نے بڑے مجمع کو پڑھائی، اور پھر دوسری نماز جنازہ ان کے وطن تکیہ کلاں دائرۂ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں رات گذار کر علی الصباح ہوئی، یہ ذمہ داری راقم نے ادا کی اور مسجد شاہ علم اللہ کے شمالی جانب اپنے عم مکرم مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے پہلو میں مدفون ہوئے جہاں ایک طرف مولانا سید عبد اللہ حسنی ندویؒ اور حضرت شاہ محمد ہدیٰ فرزند حضرت شاہ علم اللہ ہیں۔

مرحوم نے تقریباً پانچ دہائی سے ماہنامہ ''رضوان'' کی ادارت سنبھال رکھی تھی جس میں وہ شروع میں اپنے عظیم القدر والد اور میرے برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ شریک رہے اوران کی وفات کے بعد مارچ ۱۹۸۲ء جمادی الاولیٰ ۱۴۰۲ھ سے ادارت کی پوری ذمہ داری ان ہی پر آئی اور رسالہ پر سخت اور مشکل حالات بھی آئے مگر انہوں نے پرچہ کو جاری رکھا اور الحمد للہ ہمیشہ وقت پر نکلتا رہا، اور مضامین کے انتخاب میں رسالہ کے مزاج کا پورا خیال رکھا گیا، صحابیات نمبر، امہات المومنین نمبر، خلفاء راشدین نمبر، مسجد اقصی وفلسطین نمبر اور ماں نمبر کے علاوہ امۃ اللہ تسنیم نمبر، مولانا سید محمد ثانی حسنی نمبر اور مولانا سید محمد الحسنی نمبر یادگار ہیں۔

ان شاء اللہ ''تعمیر حیات'' کی خصوصی اشاعت بھی سامنے آئے گی جس میں ان کے کاموں اور خدمات کو پیش کیا جائے گا، وہ اس رسالہ کے نگراں بھی تھے، اسی کے ساتھ مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری مرحوم پر بھی مضامین ہوں گے، وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ممتاز فاضل اور اس کی مجلس انتظامی ومجلس نظامت کے مؤقر رکن اور عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ تھے، اور ''تعمیر حیات'' کے لیے بطور مدیر کچھ عرصہ اپنی خدمات بھی پیش کر چکے تھے، افسوس کہ انہوں نے بھی ہم سب کو داغ

مفارقت دیدی، اسی ندوۃ العلماء کو ایک اور نقصان اس وقت برداشت کرنا پڑا جن اس کے معتمد مال جناب اطہر حسین خالدی داغ مفارقت دے گئے، جن کی دیرینی خدمات ندوہ کو حاصل رہیں، اوران کا وجود ندوہ کے لیے مفید رہا، چند مضامین ان کی شخصیت وخدمات کے ساتھ بھی مختص ہوں گے۔

مولوی سید محمد حمزہ حسنی ندوی کا حادثۂ وفات کئی نوعیتوں سے بہت محسوس کیا جانے والا حادثہ ہے، وہ ہم اہل خاندان کے لیے جہاں ایک خاندانی حادثہ ہے، وہیں ندوۃ العلماء کے تعلق سے ایک ملی خسارہ بھی ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انہوں نے ابتدائی تعلیم سے لے کر عالی اور علیا تعلیم کے مراحل بھی اچھے انداز سے پورے کیے اور فضیلت میں حدیث کا موضوع اختیار کیا، پھر وہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ساتھ بعض سفروں میں رہے جن میں ایک سفر ملک کا بھی تھا جو عرب امارات، ریاض اور حجاز مقدس کا تھا، اس سفر میں میں بھی ساتھ تھا، اور عزیز مرحوم کی سعادت مندی اور بعض دوسری خوبیوں کا مشاہدہ ہوا جہاں مدینہ منورہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے بھی شرف نیاز حاصل ہوا تھا جن سے عزیز موصوف کا بیعت وارادت کا بھی تعلق تھا، چوں کہ برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ حضرت شیخ کے خواص اہل تعلق میں تھے، اس کا فائدہ بھی عزیز مرحوم کو حاصل ہوا، وہ حضرت مولاناؒ کے ساتھ اندرون ملک بھی چند سفروں میں ساتھ رہے، ان میں ایک اہم اور مبارک سفر بھوپال کا ہے جو ان کے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تکمیل تعلیم کے بعد کا ہے جہاں وہ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالیؒ کی صحبت سے فیض یاب ہوئے تھے اور اسی قیام بھوپال میں وہ مجالس حضرت مولاناؒ نے قلمبند کرائی تھیں جو ''صحبتے با اہل دل'' (ملفوظات حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ) کے نام سے مکتبہ الفرقان لکھنؤ سے حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے طبع کرائی اور جس کے ہندوپاک سے متعدد ایڈیشن نکلے اور بہت مقبول ہوئے اور اس کی آخری مجلس عزیز مرحوم کے والد برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے ہے۔

مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے جب دسمبر ۱۹۵۶ء کو ماہنامہ ''رضوان'' نکالا، اس وقت عزیز مرحوم کی عمر صرف ۶/سال کی تھی کہ ان کی تاریخ پیدائش ۱۵/دسمبر ۱۹۵۰ء ہے لیکن کم عمری سے ان میں لکھنے پڑھنے شوق تھا، اور اس شوق نے ان کو رسالہ میں دلچسپی کا ذریعہ بنایا پھر کچھ مدت کے بعد شریک ادارت اور اپنے والد معظم کی وفات کے بعد مستقل مدیر ہوئے اور مشکل حالات سے گذر کر وہ رسالہ کو وقت پر نکالنے میں کامیاب رہے، اس کے ساتھ مکتبہ اسلام کی جو ان کی والد کا قائم کردہ دارالاشاعت ہے، کی ذمہ داری بھی سنبھالی اور بعض درسی کتابوں کی اشاعت کے ساتھ اہم کتابیں کے بھی ناشر ہوئے، جن میں ''کاروان زندگی'' کی ۷/جلدیں خاص طور پر لائق ذکر ہیں، اس کے علاوہ اپنے خاندان کے بعض افراد کی کتابیں بھی شائع کیں اور مولانا عبداللہ عباس ندوی مرحوم کی اہم کتاب ''عربی میں نعتیہ کلام'' کے بھی ناشر بنے، راقم کی کتاب ''سماج کی تعلیم وتربیت'' بھی ان ہی کی شائع کردہ ہے۔

خدمت ودعوت دین کا دائرۂ کار ندوۃ العلماء سے ان کی علمی وانتظامی وابستگی کے بعد زیادہ وسیع ہوا جب وہ ۱۹۹۹ء میں اس کے ناظر عام (دفتر نظامت کے ذمہ دار) ہوئے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد مجلس انتظامی نے ان کے دائرہ کو مزید وسیع کیا، ان کے اختیارات بڑھے اور عہدہ امین عام (سکریٹری) کا ہو گیا جس پر وہ تاحیات فائز رہے اور ابھی چار سال قبل ان کو مہتمم دارالعلوم مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی کی تجویز پر نائب ناظم ندوۃ العلماء مقرر کیا گیا جس کی ارکان نظامت نے تائید اور پھر مجلس انتظامی نے توثیق کی، لیکن یہ ان کی سعادت مندی تھی کہ انہوں نے اتنے اختیارات حاصل ہونے کے باوجود اپنے بڑوں اور اساتذہ کا لحاظ رکھا اور بہت ضرورت پڑنے پر ہی نائب ناظم کا حق استعمال کیا، مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کی وفات کے بعد ان کو ان کے ادبی وصحافتی ذوق کی وجہ سے اور جو ذمہ دارانہ منصب حاصل تھا، ''تعمیر حیات'' کی نگرانی کی ذمہ داری بھی سپرد کی گئی اور اس ذمہ داری کو بھی انہوں نے بخوبی انجام دیا، ندوۃ العلماء کی تعمیر وترقی میں ان کے مشورے راقم کے لیے مفید ثابت ہوئے تھے، وہ اپنی رائے میں اصابت وصلاحیت رکھتے تھے لیکن اپنے بڑوں کی رائے کے ساتھ اپنی رائے دبا بھی لیتے تھے اور اس کا بار بار تجربہ ہوا، اپنی انتظامی مشغولیات کو انہوں نے تجارتی مشغولیت پر غالب رکھا اور اس کی وجہ سے انھیں تجارتی نقصان کا اندیشہ بھی ہوتا حالانکہ وہ ندوۃ العلماء کی خدمت بلا معاوضہ کر رہے تھے اور ان کو جو مشاہرہ کی پیشکش ادارہ کی طرف سے ہوئی تھی اس کو انہوں یہ کہہ کر قبول کرنے سے معذرت کر لی تھی کہ ہمارے خرچ کا انتظام ہے، ہم ندوہ کی خدمت کا معاوضہ

نہیں لیں گے، یہ خدمت والدین مرحومین کے لیے ایصال ثواب ہے، اور وہ الحمدللہ تاحیات اپنے اس فیصلہ پر قائم رہے۔
ندوۃ العلماء کے علاوہ ان کے زیر نظامت چلنے والے رائے بریلی میں دو ادارے مدرسہ بدر العلوم اور مدرسہ اصلاح المسلمین بھی میں جس کے وہ پہلے سے ذمہ دار چلے آرہے تھے اور مدرسہ فلاح المسلمین امین نگر تیندوا کے بھی وہ اپنے محترم چچا مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی مرحوم کے معاون ونائب کی حیثیت سے ذمہ دار تھے، اس کے علاوہ مولانا محمد ثانی حسنی لائبریری، مولانا محمد ثانی حسنی میموریل ایجوکیشنل سوسائٹی اور اس کے تحت چلنے والے اداروں کی رہنمائی کرتے تھے جن کے وہ ایک طرح سے بانی کی حیثیت رکھتے تھے، مولانا امتیاز احمد ندوی کی وفات کے بعد اس کے جنرل سکریٹری بھی ہوگئے تھے، اپنے وطن رائے بریلی کے قصبات واطراف میں اصلاحی ودعوتی دورے بھی کیے اور جب مسلم مجلس کا قیام عمل میں آیا تو اس سلسلہ میں سیاسی رہنمائی بھی عوامی سطح پر کی تھی، ان کی بہت سی خوبیوں کا علم ان کی وفات کے بعد ہوا جو ان کے لحاظ، تعلق اور نیاز مندانہ مزاج اور کم سخنی کی وجہ سے ان کی زندگی میں نہیں ہوسکا تھا، انہوں نے دو بیٹے عزیزان رشید احمد وسعید احمد یادگار چھوڑے جو دار العلوم ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ ہیں۔

مولوی نذر الحفیظ ندوی ازھری کو ابتدائی تعلیمی وتربیتی مرحلہ میں جو پرتا پگڈھ میں گذرا تھا جہاں ان کے والد قاری عبدالحفیظ ململی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام تھا، حضرت مولانا محمد احمد پرتا پگڈھیؒ کی سرپرستی ملی تھی، پھر دار العلوم ندوۃ العلماء آئے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن حسنی ندوی کی سرپرستی حاصل کی اور بیعت وارادت کا تعلق بھی پیدا کیا اور وہ رابطہ وتعلق ہوگیا کہ سفروں میں بھی ساتھ ہونے لگا، اور ان کے وطن دائرۂ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں بھی قیام کا موقع ملا اور ان کی تیمارداری اور خدمت کا بھی موقع ملا، اس کے ساتھ وہ ان کے تصنیفی کاموں میں معاون بھی ہونے لگے اور معاون علمی کے طور پر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے وابستہ ہونے کے ساتھ دار العلوم ندوۃ العلماء میں مدرس بھی ہوئے، پھر کچھ مدت کے لیے قاہرہ (مصر) گئے اور وہاں سے آکر کسی اچھی تنخواہ کی ملازمت کے بجائے ندوہ کی خدمت کو اختیار کیا، جب کہ ان میں وہ صلاحیت پیدا ہوچکی تھی کہ وہ اچھے مشاہرہ پر اچھی ملازمت اختیار کرسکتے تھے، حضرت مولاناؒ کی فکر اور ان کی کتابوں سے واقفیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ خود حضرت مولاناؒ ان سے بہت سی باتیں پوچھتے، عربی میں ان کی کتاب "الأستاذ أبو الحسن الندوي كاتباً و مفكراً" اور آخر میں حضرت مولاناؒ کی مجالس سے متعلق کتاب "مجالس علم وعرفاں" اس کے لیے شاہد عدل ہیں۔
مولانا نذر الحفیظ ندوی کا ندوۃ العلماء میں دوسرا ۱۹۸۳ء سے شروع ہوتا ہے، جو قاہرہ مصر سے واپسی کا ہے، ندوہ کی اور حضرت مولاناؒ کی ملک وملک کے باہر ان کو نمائندگی کا بھی موقع ملا اور اچھی نمائندگی، رابطہ ادب اسلامی کے سیمیناروں اور اجلاس میں ان کی اچھی کارکردگی رہتی تھی جو ملک کے مختلف حصوں میں ہوتے تھے، ملک سے باہر استنبول (ترکی)، لاہور (پاکستان) اور بنگلا دیش وغیرہ کے اجلاس میں بھی انہوں نے اچھا حصہ لیا، وہ ایک اچھے استاد بھی تھے اور ان کو دار العلوم کے عربی زبان وادب کے شعبہ کلیۃ اللغۃ العربیہ کی ذمہ داری بھی ملی تھی جس کے وہ وکیل اور پھر عمید مقرر ہوئے اور بعض موقعوں پر قائم مقام مہتمم کی ذمہ داری بھی ادا کی، ان کو صحافت کا اچھا ذوق تھا، سب سے پہلے ہفت روزہ "ندائے ملت" کے لیے ان کی خدمات لی گئیں اور کچھ مدت "تعمیر حیات" کے مدیر کی حیثیت سے بھی خدمات پیش کیں، رابطہ ادب اسلامی کے مجلّہ "کاروان ادب" کے بھی ادارتی بورڈ میں تھے، وہ ایک حافظ قرآن بھی تھے اور مصر کے ایک عالمی مسابقہ قرآن مجید میں ان کو تفوق وامتیاز حاصل ہوا تھا اور حج کی سعادت ملی تھی، جب ندوۃ العلماء کا ایک وفد جو مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی پر مشتمل تھا، مصر پہنچا تو وہاں انہوں نے اپنے وسیع تعلقات وروابط سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سفر کو ندوہ کے لیے مفید تر بنانے کی کوشش کی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی مطبوعات اور فکر کی اشاعت کا بھی اچھا اور قابل قدر کام کیا، حضرت مولاناؒ ان پر اعتماد کرتے اور ان پر شفقت فرماتے تھے جسے حضرت مولاناؒ کے ان کے نام خطوط سے سمجھا جاسکتا ہے جو انہیں اور بعض دوسری شخصیات کو لکھے ہیں، کیا معلوم تھا کہ ان کا حادثۂ وفات بھی ان ہی حوادث میں جگہ پائے گا جو ادھر ایک دو ماہ کے عرصہ میں بعض اہم شخصیات کے اٹھ جانے سے پیش آئے ہیں۔

جناب اطہر حسین خالدی معتمد مال ندوۃ العلماء نے بھی ۲۳؍رمضان المبارک جمعرات کو علالت کے ایک مرحلہ سے گذر کر لکھنؤ میں وفات پائی، ان کا بھی ندوہ سے تعلق قدیم اور محبانہ و مخلصانہ تھا حالانکہ وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے تعلیم یافتہ نہیں تھے، اطہر حسین صاحب مرحوم تقریباً میرے ہم عمر اور ہم فکر تھے، ملی، رفاہی، دعوتی اور تعلیمی امور سے متعلق مشوروں میں شریک رہتے تھے، دار العلوم میں انگریزی اور اس کے متعلق مضامین کے استاد بھی رہے، ان کے زمانہ میں یہاں تعلیم حاصل کرنے والوں میں حضرت مولانا احمد لاٹ ندوی وغیرہ کے اہم نام ہیں، اسلامیہ کالج لکھنؤ میں تدریسی خدمات انجام دیئے اور پھر پرنسپل کے منصب پر فائز ہوئے، بعد میں ان سے ملاقات ومشورہ کا سلسلہ ختم نہیں ہوا بلکہ اس تعلقات کو انہوں نے اسی طرح قائم رکھا، ریٹائرڈ ہونے کے بعد ندوۃ العلماء کو خدمات پیش کیں اور کچھ مدت شعبۂ امتحانات کے ذمہ دار رہ کر مجلس صحافت ونشریات کے سکریٹری اور پھر پروفیسر وصی احمد صدیقی کی وفات کے بعد اس ذمہ داری کے ساتھ مزید معتمد مال کی ذمہ داری بھی دیے جانے پر اس کو بخوبی انجام دینے لگے اور ان سے ندوۃ العلماء کو بڑی تقویت حاصل ہوئی، ان کا حادثہ بھی ایک خاندانی حادثہ سے کم نہیں ہے۔

ڈاکٹر شاہ عبادالرحمن نشاط رکن مجلس نظامت ومجلس انتظامی ندوۃ العلماء کا حادثۂ وفات بھی ۲۵؍رمضان المبارک ۱۴۴۲ھ کو دہلی میں پیش آیا، جو اپنے قریبی اہل تعلق اور ندوۃ العلماء کے متعلق شخصیات میں اہم فرد تھے، ان سے بھی ہم لوگوں کا تعلق قدیم تھا اور ان کی خصوصیات کا علم اس وقت زیادہ ہوا جب وہ شکاگو امریکہ میں تھے اور حضرت مولانا کا دو مہینے امریکہ میں قیام رہا تھا جس میں میں بھی تھا، پھر وہ مکہ مکرمہ آگئے اور ام القریٰ یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد ہوئے، اس کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کرلی، چنانچہ وہیں وہ اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے، ان کی صلاحیتوں سے جو علمی اور طویل تعلیمی تجربہ کی تھیں، فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی اور اہم کتابوں کے انہوں نے ترجمہ بھی کیے، اس کے ساتھ وہ خود بھی مصنف تھے اور ذاکر وشاغل بھی، اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے اجازت وخلافت بھی حاصل تھی۔

ڈاکٹر سید قمرالدین اورنگ آبادی بھی اب ہمارے درمیان نہیں رہے، اہل تعلق میں ان کی شخصیت اس اعتبار سے بھی اہم تھی کہ وہ ندوۃ العلماء کے ارکان مجلس انتظامی میں منفرد مقام رکھتے تھے، بڑی پابندی سے اس کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوتے اور مفید مشوروں سے نوازتے۔

مولوی رئیس الشاکری ندوی کلیۃ اللغۃ العربیۃ کی لائبریری کے ذمہ دار کا بھی حادثۂ وفات ماہ رمضان المبارک میں ہی پیش آیا، جو ایک قدیم ندوی فاضل تھے، انہوں نے فراغت کے بعد امامت وخطابت اور مختلف ذمہ داریوں کو انجام دیا، وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے، ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ سے ہی شاعری شروع کردی تھی، ادھر تقریباً بیس برسوں سے ندوہ سے وابستہ تھے، اور لائبریری میں خدمت کررہے تھے، ان کے کئی شعری مجموعے بھی منظر عام پر آئے جو مقبول ہوئے، وہ حمد ونعت کے اشعار بہت عمدگی اور عشق ومحبت میں ڈوب کر کہتے تھے، اور دیگر اصناف شعر پر بھی انہیں عبور حاصل تھا، افسوس کہ وہ بھی مختصر علالت کے بعد ماہ رمضان ہی میں ہم سب سے جدا ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کے علاوہ کئی اہم شخصیات نے گزشتہ ایام میں اس دار فانی سے کوچ کیا، جو دیگر تعلیمی وملی اداروں سے تعلق رکھتے تھے، اور ان کی دینی وعلمی خدمات امت اسلامیہ کو حاصل تھیں، ان شخصیات میں ایک نمایاں نام مولانا نور عالم خلیل الامینی سابق مدرس دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ہے، جو دار العلوم دیوبند کے عربی ماہنامہ "الداعی" کے رئیس التحریر اور شعبۂ ادب عربی کے فاضل استاد تھے۔ ایک اور عظیم شخصیت مولانا قاری محمد عثمان منصور پوری استاد حدیث و معاون مہتمم دار العلوم دیوبند، ان سے قبل دار العلوم ہی کے استاد حدیث ومدیر ماہنامہ "دار العلوم" مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، جامعہ مظاہر علوم کی اہم شخصیت قاری رضوان نسیم اور مولانا ماجد مسعود محمد حشیم مدرسہ صولتیہ مکہ کرمہ وغیرہ وہ شخصیات ہیں جن کی وفات سے امت مسلمہ کو بڑا خسارہ ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کی دینی، دعوتی، تعلیمی اور ملی خدمات کو قبول فرمائے، سیئات سے درگزر کرے، ان کے درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆

چشم کشا

نسل نو کی تعلیم و تربیت کی فکر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

اسلام اور جاہلیت

پڑھے لکھے لوگوں نے دو لفظ سنے ہوں گے: ایک اسلام، اور دوسرے جاہلیت، یہ قرآنی اصطلاحات ہیں، اور کثرت سے یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں، لیکن جاہلیت کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو ذہن عہد رسالت کے قبل کے زمانہ کی طرف منتقل ہوتا ہے، رسالت سے قبل ساری دنیا میں جہالت پھیلی ہوئی تھی، لوگ خدا کو بھول گئے تھے، اور زندگی کے مقصد کو بالکل فراموش کر چکے تھے، اور انسانیت کے منصب اور خدا سے اس کا جو تعلق ہونا چاہیے تھا، اس کو بھول گئے تھے، عام طور سے لوگ اس کو ایک تاریخی عہد سمجھتے ہیں، اور اسلام کے پہلے کے زمانے کو عہد جاہلیت کہتے ہیں، اس کے بعد کا دور اسلامی کہلاتا ہے۔

اسلام کے معنی

اسلام کے معنی اپنے کو اللہ کے حوالہ کر دینا ہے، اپنی تمام چیزوں، اپنی خواہشات، اپنے ماضی، اپنے فوائد، اپنے اغراض اور اپنے ان مقدسات سے جو اس کے دل و دماغ پر حاوی ہیں، ان کے قابو سے نکل جانا اور ان سے دست بردار ہو جانا ہے، جسے انگریزی میں Surrender کرنا کہتے ہیں، اللہ و رسول کے احکام پر چلنا یعنی خدا چاہی زندگی گزارنا اسلام ہے۔

جاہلیت کا مطلب

اور جاہلیت کے معنی ہیں: من مانی زندگی گزارنا، جو دل میں آئے وہ کرنا، جیسا ہو رہا ہے ویسا کرنا، جو لوگ چاہتے ہیں اس کے مطابق کرنا، جس میں آدمی فائدہ دیکھے وہ کرنا، جس میں شہرت ملے، عزت ملے، نام و نمود ملے وہ کرنا، جو جی میں آئے وہ کرنا، جس میں مزہ آئے اور جس میں فائدہ معلوم ہو، جس میں چرچا ہو، تذکرہ ہو، لوگ تعریفیں کریں، جس میں لذت ملے اور عزت ملے وہ کرنا۔

لیکن جاہلیت کے متعلق آپ کے ذہن میں ایک بات یاد رہنا چاہیے کہ جاہلیت جہالت کے لفظ سے ہے، اور جہالت جاہلیت پیدا کر دیتی ہے، اسلام قبول کرنے کے بعد، مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کے بعد، اپنے کو مسلمان کہلانے کے بعد، اگر آدمی نے دین کی ضروری اور بنیادی معلومات حاصل نہیں کیں، قرآن مجید کا مطالعہ نہیں کیا، ترجمہ کے ذریعہ، عالموں کے ذریعہ، دینی کتابوں کے ذریعہ اس کو اللہ و رسول کا منشا نہیں معلوم ہوا اور اس نے اس کی کچھ پرواہ نہیں کی تو وہ جاہلیت پھر آ جائے گی، یعنی وہ جاہلیت جو گزر گئی اس کے متعلق ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ واپس نہیں آ سکتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرمایا: "أَجَاهِلِيَّةٌ بَعْدَ الْإِسْلَامِ؟"، کیا اسلام کے بعد جاہلیت چاہتے ہو؟ اور ایک صحابی جن سے ایسی ہی غلطی ہوگئی تھی، ان کے متعلق آپ نے فرمایا: "إِنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ" [صحیح بخاری، رقم ۳۰] (تم ایسے آدمی ہو جس کے اندر جاہلیت کی بو باقی ہے)، تو معلوم ہوا کہ جاہلیت کوئی گزرا ہوا زمانہ نہیں ہے، جو گزرے ہوئے وقت کی طرح واپس نہ آ سکتی ہو، بلکہ جاہلیت ایک طرز زندگی کا نام ہے، اور اس طرز زندگی کو بنیادی طور سے جو چیز جاہلیت بناتی ہے وہ جہالت ہے، تو اسلام کا جہالت کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے۔

اسلام کے تقاضے

اسلام کے لیے ضروری ہے کہ بنیادی معلومات حاصل ہوں اور آدمی کو معلوم ہو کہ کیا چیز اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اور کیا چیز اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے؟ کیا چیز اللہ و رسول کے منشا کے مطابق ہے؟ کیا چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ ہے؟ کیا چیز مسلمان، ایمان اور عقیدہ کے مطابق ہے اور کیا چیز مطابق نہیں ہے؟ تو اس کا علم حاصل کرنا اپنے لیے بھی، اپنے بچوں کے لیے بھی، آئندہ نسلوں کے لیے بھی، اور اس کا انتظام کرنا ضروری ہے، اگر ہمیں قرآن مجید کی زبان سمجھنے اور اللہ تعالیٰ کے کلام کا وزن معلوم ہو، اور اللہ تعالیٰ کے کلام کی سطح اور شان سے واقف ہوں اور یہ معلوم ہو کہ اس کلام کا ایک ایک لفظ کتنی گہرائی رکھتا ہے، اور کتنی بلندی رکھتا ہے، اور اس کی کتنی اہمیت اور قدر و قیمت ہے، تو ہم کانپ جائیں۔

علماء کون ہیں؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا" [سورۃ فاطر: ۲۸]، "إِنَّمَا" کلمۂ حصر ہے، یعنی اس کے سوا کچھ نہیں، اللہ سے وہی ڈرتے ہیں، اللہ سے وہی ڈر سکتے ہیں، وہی ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں، اردو زبان میں

علماء سے مولوی صاحبان، مدارس کے فضلاء - اللہ تعالیٰ ان کی تعداد میں اضافہ کرے، اور ان کے علم سے فائدہ پہنچائے - مراد لیے جاتے ہیں، لیکن کلام الٰہی اور کلام نبوت میں ان کا علم محدود نہیں ہے، "العلماء" جب کہیں گے تو ہمارے سامنے بڑے بڑے علماء آئیں گے، حکیم الاسلام حضرت تھانویؒ کا نام آئے گا، حضرت مدنیؒ کا نام آئے گا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کا نام آئے گا، مولانا سید سلیمان ندویؒ کا نام آئے گا، "العلماء" کے معنی ہیں: جاننے والے کے، جب اللہ نے یہ فرمایا کہ اللہ سے علماء ڈریں گے، اللہ سے وہی ڈر سکتے ہیں جو علم رکھتے ہیں، تو معلوم ہوا کہ یہ دین جو ہم کو اسلام کے نام سے ملا ہے، یہ علم سے جڑا ہوا ہے، اس کا علم کے ساتھ ایسا رشتہ ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا، علم اسلام کا ایک ضروری اور بنیادی عنصر ہے، اس میں صحیح عقائد کا علم ہوجائے، فرائض کا علم ہوجائے، اللہ تعالیٰ کی ضروری تعلیمات کا علم ہوجائے، اللہ تعالیٰ کے منشا وفرمان کا علم ہوجائے، کیا چیزیں ہم پر فرض اور واجب ہیں، کیا اسلام ہے اور کیا کفر ہے، اس کا فرق معلوم ہوجائے، اور کیا توحید ہے اور کیا شرک ہے، کفر اور ایمان کا فرق معلوم ہو، توحید اور شرک کا فرق معلوم ہو، بدعت وسنت کا فرق معلوم ہو، طاعت اور معصیت کا فرق معلوم ہو، حرام و حلال کا فرق معلوم ہو، جائز و ناجائز کا فرق معلوم ہو، اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات کا فرق معلوم ہوجائے۔

علم کیسے حاصل ہو؟

وہ علم جو اسلام کے لیے ضروری ہے، وہ مواعظ کے ذریعہ، صحبت کے ذریعہ، تبلیغی جماعت میں شامل ہوکر، یا کوئی اور ایسا ماحول اور صحبت اختیار کرکے ضروری علم حاصل کرے، علم کے وسائل بہت ہیں اور الحمد للہ آسان ہوگئے ہیں، اور مدرسوں کی وجہ سے اور بھی سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں، کتابوں کی کثرت ہے، مدارس کا فیض عام ہے۔

دینی مدارس کی اہمیت و افادیت

یہ مدارس کوئی معمولی چیز نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو قائم رکھے، ان کی وجہ سے ہندوستان کی ملت اسلامیہ اپنی خصوصیات کے ساتھ باقی ہے، آزادی سے قبل کا زمانہ مجھے یاد ہے، جب انگریزوں کا اقتدار شباب پر تھا، اس وقت خلیفہ شجاع الدین نے ایک رسالے میں مضمون لکھا کہ اب ان مدرسوں کی کیا ضرورت ہے؟ اب زمانہ بدل گیا ہے، ان مدرسوں کو اسکولوں میں تبدیل کردینا چاہیے، اور وہاں انگریزی زبان پڑھائی جائے اور سائنس کی تعلیم دی جائے، جیسا کہ آج بعض لوگ مطالبہ کرتے ہیں، علامہ اقبال نے کیمبرج اور جرمنی سے قانون، اقتصاد اور فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کیا تھا، انھوں نے اس کا جواب دیا کہ خدا کے لیے تم یہ نہ کہو، اگر یہ مدارس نہ رہے تو ہندوستان اسپین بن جائے گا، اسپین میں کیسے کیسے ولی اللہ مدفون ہیں، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی وہاں مدفون ہیں، فقہ مالکی میں ایک اصولی مسئلہ ہے کہ ان کے یہاں اہلِ مدینہ کا عمل حجت ہے، اس میں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے، ویسے ہی ایک زمانہ میں یہ مسئلہ بن گیا تھا کہ عملِ قرطبہ حجت ہے، وہاں علماء کے فیض اور عربی علوم کے اثر سے اور محققین کے پیدا ہونے سے اور گھر گھر عالموں کے ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی اسلام کے ڈھانچہ میں ڈھل گئی تھی کہ اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ قرطبہ میں ایسا ہوتا تھا، جس ملک کا ایسا حال ہو، وہاں کا عمل حجت ہو، اور پوری شمالی افریقہ کی پٹی جو لیبیا اور سوڈان سے شروع ہوتی ہے اور مراکش تک جاتی ہے، اور پھر اسپین تک جاتی تھی، یہ سارے علاقے سو فیصدی مالکی ہیں، ایسا کوئی ملک نہیں جو سو فیصدی حنفی ہو، وہ ملک مسلمانوں سے خالی ہوجائے۔

علم ہمارے لیے ضروری کیوں؟

علم ہمارے لیے اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا اسلام کے ساتھ وابستہ رہنا اور اسلام پر پورے طور پر چلنا اس کے بغیر ممکن نہیں، بلکہ ناممکن ہوسکتا ہے، اور کم سے کم ہمارا ہندوستان جیسا ملک ہے، جس کے چاروں طرف جہالت کی جو فضا ہے، اور جو کفر وشرک اور دوسرے مذاہب، میتھا لوجی (دیومالائی) جو پھیلی ہوئی ہے، اور اب آج کل ریڈیو، ٹی وی کے ذریعہ، پریس کے ذریعہ، تاریخ کے ذریعہ اور ہر طرح سے وہ چیزیں پھیلائی جارہی ہیں، جو کبھی ہندوستان میں تھیں، وہ بھی سامنے لائی جارہی ہیں، اس صورت میں دین کی تعلیم کی سخت ضرورت ہے، گویا اس وقت اسلام کے باقی رہنے کا دارومدار اس پر ہے کہ آپ کے گھر والوں کو، آپ کے بچوں کو ضروری دینی معلومات حاصل ہوں، اس کا انتظام ہونا چاہیے، بار بار کہا اور لکھا ہے کہ بچوں کی صحت اور بچوں کے کپڑے بنوانے، بچوں کے دوا علاج کرنے، بچوں کو بیماریوں سے تحفظ فراہم کرنے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے کہ ان کو اللہ و رسول سے واقف کرائیں اور ان کو کفر و ایمان کا فرق بتائیں، انھیں شرک و توحید کا فرق بتائیں اور شرک و بت

پرستی کا فرق بتائیں، ہماری ماؤں اور بہنوں پر فرض ہے اور گھر کے لوگوں پر فرض ہے کہ ان کے دل میں ان سے گھن پیدا کریں، ایسی گھن جو گندگی و پاخانہ پیشاب سے ہوتی ہے۔

شرک و کفر اور اس کے مظاہر سے نفرت

جب تک ہماری نئی نسل کے دل میں بت پرستی، چاہے وہ کسی قسم کی بت پرستی ہو، اس کائنات میں کسی کو متصرف ماننے، کسی کو کارساز ماننے، کارفرما ماننے، اور اپنی قسمت کا بنانے والا اور بگاڑنے والا جاننے، اس سے جب تک گھن نہ آئے جیسے پاخانہ اور پیشاب اور گندی چیزوں سے ہوتی ہے، اس وقت تک اس کے ایمان کا اطمینان نہیں ہے کہ وہ اپنے ایمان پر قائم رہے گا۔

کفر و شرک سے مسلمانوں کو ایسی نفرت ہونی چاہیے جیسے آگ میں ڈالے جانے سے نفرت ہو، کفر و شرک کی تمام شکلوں سے جب تک اس کے دل میں نفرت نہ ہو، اور ہندوستان میں جو دیومالائی چیزیں ہیں، اور بت پرستی کی جو چیزیں ہیں اور یہاں کے دیوتاؤں کے بارے میں جو خیالات ہیں، اس سے نہ صرف بچا رہے، یہ ایک بڑی نعمت ہے، بلکہ اس سے نفرت ہو، اور اس کے نام سے اس کا ذائقہ خراب ہو جائے، اور اس کے دل و دماغ اور احساسات پر ایسا اثر پڑے جیسے کوئی گندی چیز کھالی ہے۔

بچوں کو دینی تعلیم دینا اور ایسی دینی تعلیم کا انتظام کرنا جس سے اس کو دین کا ضروری علم حاصل ہو جائے بلکہ کفر اور شرک سے ایک قسم کی نفرت، وحشت نہ پیدا ہو، اس وقت تک اطمینان نہیں کہ وہ کفر و شرک کا کوئی کام نہ کر گزرے، مائیں ایسے قصے سنائیں جس سے کفر و شرک کا فرق معلوم ہو، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ سنائیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام آزر کے گھر میں پیدا ہوئے، جہاں صرف حکومت بت پرستوں کی نہیں تھی بلکہ ان کا معاش بھی اس سے وابستہ تھا، یعنی اعتقادی اور اقتصادی دونوں طور سے بت سازی ان کے گھر میں تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو داعی کبیر بنایا تھا، بلکہ موحّد اُمت کا بانی بنایا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے کفر و شرک کے فرق کو "یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا" [سورۃ الأنبیاء:۶۹] (اے آگ! تو ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوجا) سے عیاں کردیا، ایسے قصوں سے، ایسے واقعات سے بچوں میں، گھروں میں اور ماحول میں کفر و شرک کا امتیاز پیدا ہوگا، اور اسلام کا صحیح علم حاصل کرنے کی رغبت پیدا ہوگی، اسی لیے علم کو اسلام کے ساتھ مربوط رکھا گیا ہے تاکہ مسلمان اسلامی تعلیمات کے ساتھ مسلمان رہے، ایمان و عقیدہ کے ساتھ مسلمان رہے۔

☆☆☆☆☆

'رضوانِ الٰہی' حاصل کرنے کی ایک مجرب صورت

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

اگر 'خدمت' کا 'اجر و ثواب' آپ اپنے حصہ میں رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہ ہے کہ بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے ہٹیے، بجائے خودستائی اور خودنمائی کے اپنی کمزوریوں پر نظر رکھیے، اپنے نفس کی اصلاح پر توجہ رکھیے، اپنی لغزشوں اور خطاؤں کی یاد دل سے مٹنے نہ دیجیے، اور ان سے بچنے کی کوشش میں دل و جان سے لگے رہیے، اس دھن میں نہ پڑے رہیے کہ شاعر آپ کی مدح میں قصیدے لکھیں، اخبارات آپ کی تعریف میں مضمون شائع کریں اور آپ کے ہم نشیں اور مصاحب آپ کو آپ کی پاکیزگی و پاکی کا یقین دلاتے رہیں، بلکہ فکر اس کی رکھیے کہ دل پر گناہ کی سیاہی نہ جمنے پائے، پیر ٹیڑھی راہ پر نہ پڑنے پائیں، زبان بے موقع نہ کھلے اور نامۂ اعمال کے کاتبوں کو اس کے خلاف رپورٹ تیار کرنے کا آپ کے امکان بھر، موقع ہی نہ ملنے پائے، مخلوق جو کچھ چاہے، آپ کے بارے میں رائے قائم کرے، لیکن آپ کا معاملہ آپ کے خالق سے بالکل صاف رہے، اس بے لوث، بے لاگ زندگی بسر کرنے کے سلسلہ میں اگر خدمت خلق کے موقعے بھی از خود ہاتھ آتے جائیں اور دوسرے آپ کو اس کا اہل سمجھیں تو آپ ایسے موقع پر سجدۂ شکر کیجیے کہ اللہ نے خدمت خلق کی سعادت آپ کے نصیب میں رکھی، نہ یہ کہ آپ کے دل میں اس سے ایک ذرہ بھر بھی اپنی 'ناموری'، 'عزت و مرتبہ'، 'شان و جاہت' کا احساس پیدا ہو، یہ اس 'دارِ فانی' میں رہ کر 'حیاتِ ابدی' و 'رضوانِ الٰہی' حاصل کرنے کی ایک قدیم و مجرب صورت ہے۔

☆☆☆

حکمت ربانی

صبر کا مقصد اور اس کی شکلیں

ڈاکٹر یوسف القرضاوی

قرآن مجید میں صبر کا حکم دیا گیا ہے، جس کی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں اور اس پر عظیم اجر کا وعدہ کیا گیا ہے، لیکن اگر کوئی شخص مسائل ومشکلات میں یہ سوچ کر صبر کرے کہ دنیا میں اس کا نام ہوگا یا لوگ اسے صابر وشاکر کے القاب سے یاد کریں گے تو اس کا کوئی اجر نہیں ہے، بلکہ الٹا وبال ہوگا، لہٰذا دیگر عبادات کی طرح صبر کا عمل بھی خالصتاً للہ ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی رضا کے لیے صبر کیا، نمازیں قائم کیں اور ہمارے دیے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کیا، اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں، آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لیے ہے''۔[الرعد:۲۲]

صبر کا محل

قرآن مجید میں صبر کا حکم دیا گیا ہے، لیکن یہ صبر کن باتوں پر کیا جائے، قرآن نے اس کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں جو پر درج ذیل ہیں:

آفات دنیا پر صبر

اس دنیا میں مسائل ومشکلات کے انبار ہیں، حاشیہ، مرض، موت اور تنگ دستی روزانہ کے معمولات میں شامل ہیں، یہاں پر کوئی ایسا آدمی نہ ہوگا جو سدا خوش رہے اور اسے کبھی کوئی پریشانی لاحق نہ ہو، بلکہ ہر شخص مصائب ومشکلات میں مبتلا ہوتا ہے اور ان کا بہترین علاج صبر، قرآن مجید نے اسی کا حکم دیا ہے۔

''اور ہم ضرور تمہیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائشیں کریں گے، ان حالات میں جو صبر کریں انہیں بشارت دے دو''۔[البقرۃ:۱۵۵]

نفسانی خواہشوں پر صبر

آفات دنیا کے مقابلے میں آسائش دنیا ہے اور یہیں سے خواہشیں جنم لیتی ہیں، انسان کے اندر عورت، چاندی، سونا، سواری، زمین، جائیداد اور دنیاداری کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''لوگوں کے لیے مرغوبات نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں، بڑی خوش آئند بنادی گئی ہیں، مگر یہ سب دنیا کی چندروزہ زندگی کے سامان ہیں، حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے''۔[آل عمران:۱۴]

انسان کے اندر نہ صرف خواہشیں پائی جاتی ہیں، بلکہ اس میں ھل من مزید کا رجحان بدرجہ اتم موجود ہے، وہ نہ صرف کھانا پینا چاہتا ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ کھانے کی خواہش رکھتا ہے، اگر جائز حدود میں وہ اپنی خواہش پوری رکے تو کوئی بات نہیں ہے، لیکن حرام ذرائع بھی استعمال کرنے سے وہ نہیں چوکتا ہے، شریعت کا منشا یہ ہے کہ وہ ایسے موقع پر صبر سے کام لے اور غلط طریقے سے اپنی خواہشیں پوری نہ کرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''کھاؤ اور پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔[الاعراف:۳۱]

جماع کی خواہش کو اعتدال میں رکھنے کے بارے میں ارشاد ربانی ہوتا ہے:

''یہ سہولت تم میں سے ان لوگوں کے لیے ہے جن کو شادی نہ کرنے سے بند تقویٰ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہوم لیکن اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔[النساء:۲۵]

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

''اور جو نکاح کا موقع نہ پائیں تو انہیں چاہیے کہ عفت مآبی اختیار کریں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو مالدار وغنی کردے''۔[النور:۳۳]

قوت غضب (غصہ) پر قابو رکھنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو اس قدر لے لو، جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہے لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہتر ہے''۔[النحل:۱۲۶]

اللہ کی اطاعت پر صبر

اللہ تعالیٰ نے مختلف احکام جاری کیے ہیں، ان کی تعمیل صبر کے بغیر ممکن نہیں، مثال کے طور پر شدید سردی میں نماز باجماعت کی پابندی کرنا یا دولت کی محبت کے باوجود زکوٰۃ ادا کرنا، اسی طرح حج اور جہاد مشکلات کو برداشت کیے بغیر انجام دیا ہی نہیں جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وہ رب ہے، آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو ان کے درمیان ہیں پس تم اس کی بندگی کرو اور اس کی بندگی پر ثابت قدم رہو، کیا ہے کوئی ہستی تمہارے علم میں اس کی ہم پایہ؟۔ [مریم:۶۵]

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

''اور اپنے اہل وعیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو''۔[طٰہٰ:۱۳۲]

یہاں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں صبر کا مادہ افتعال کے وزن پر وارد ہے، جس میں مبالغہ کا معنی پایا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر صبر کی تین صورتوں میں ضرورت پیش آتی ہے:

اطاعت سے پہلے

جیسے نیت کو خالص کرنا اور اس کے لیے ضروری تیاری کرنا، اہل معرفت جانتے ہیں کہ اعمال میں خلوص پیدا کرنا کتنا مشکل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کرکے''۔[البینۃ:۵]

صحیح حدیث میں وارد ہے:

''بے شک اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، آدمی کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی ہوگی''۔

اطاعت بجالاتے وقت

شریعت میں مختلف احکامات دیے گئے ہیں، اور ان کی ادائیگی کے مختلف آداب بتائے گئے ہیں، احکام پر عمل کرنا بہت آسان ہے مگر ان آداب کو ملحوظ رکھنا مشکل ہے، مثال کے طور پر نماز پڑھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے لیکن اس کی پابندی کرنا، خضوع کو باقی رکھنا اور شدید سردی کے موسم میں وضو کرنا اور جماعت کی پابندی کرنا زیادہ مشکل ہے، انہیں مشکلات کو برداشت کرنا صبر ہے۔

اطاعت کے بعد

آدمی جب عبادت کی مشکلات کو برداشت کر کے اس کو ادا کر لیتا ہے، تو اس کے اندر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس کی خوبی پر تعریف کی جائے، لوگ اسے اچھا کہیں اور سماج میں اس کا اونچا مقام ہو، اسی کا نام ریا ونمود ہے، جو شریعت میں ممنوع ہے اور جس سے بڑے سے بڑا عمل باطل ہو جاتا ہے، چاہے آدمی نے اللہ کی راہ میں جان ہی کیوں نہ دے دی ہو، اگر اس کی نیت میں ریا کا شائبہ ہے تو اس کا کچھ اجر نہیں ہے، اللہ کی عبادت میں صبر کرنے کا ایک معنیٰ یہ بھی ہے کہ ریا ونمود سے بچا جائے۔ [ترجمانی: محمد ظہیر]

☆☆☆☆☆

نقطۂ نظر و اندازِ فکر کی تبدیلی کے بغیر کوئی فائدہ نہیں!

مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہریؒ

ایک بنیادی بات جس کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے، وہ یہ کہ قرن اول اور اس کے بعد کی صدیوں میں بھی مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ کوئی بڑا اقدام کرنے سے پہلے یا کسی غیر معمولی واقعہ اور نازک حالات میں جس میں مسلمانوں کے لیے بظاہر خطرہ زیادہ نظر آرہا تھا، وہ پہلے اپنی طرف سے اطمینان کر لیتے پھر اس کے بعد اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتے، وہ یہ دیکھتے کہ ہم میں معصیت تو عام نہیں ہوگئی ہے، ہماری صفوں میں انتشار و اختلاف تو نہیں ہے، ہمارے اندر حرص وطمع اور دنیا کی محبت تو نہیں پیدا ہوگئی ہے؟ اس طرف سے اطمینان ہو جاتا تھا تو ان کا تردد دور ہو جاتا تھا اور وہ محسوس کر لیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ضائع نہیں کرے گا، یہی وہ انداز فکر یا وہ شاہ کلید ہے، جس سے زندگی کا ہر قفل کھل سکتا ہے، ایک ایک چیز کی فریاد کرنے، دَر دَر ہاتھ پھیلانے اور ہر کس وناکس کی خوشامد کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اپنے ایمان، اپنے اخلاص، اپنے عمل اور اپنی ذات سے اس خدا کو راضی کرنے کی فکر کی جائے جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے اور جس کے حقیقی نام لیواؤں اور جس کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ادنیٰ غلاموں کا حال یہ ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت اور حکومتیں ان کے سامنے مٹی کے گھروندوں اور سنگریزوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں، نقطۂ نظر اور اندازِ فکر کی اس مرکزی تبدیلی کے بغیر سیاسی احتجاج اور عظیم الشان جلسوں اور گرجدار تقریروں سے کوئی فائدہ نہیں ہونے والا ہے۔

اس امت کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ اس نے ہمیشہ نامساعد حالات اور دشواریوں اور تلخیوں کو گرِ راہ سمجھا، لیکن خدا سے اپنا معاملہ درست کرنے اور اس کی شرائط پوری کرنے کے بعد، حضرت ابوبکرؓ کا لشکر اسامہ کو بھیجنا بھی حالات کے تقاضوں کے خلاف تھا، حضرت خالدؓ کا مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ لاتعداد رومیوں سے مقابلہ کرنا بھی حالات کے خلاف تھا، اندلس میں مجاہدین کے اترنے کے بعد طارق بن زیاد کا کشتیاں جلوا دینا اور مسلمانوں کا بحر ظلمات میں گھوڑے ڈال دینا بھی حالات کے خلاف تھا، لیکن یہ ہمیشہ یاد رہے کہ یہ سب مسلمانوں کی دینی حالت اور دینی مستقبل کی طرف سے اطمینان کے بعد تھا، اس سے پہلے نہیں۔ ☆☆☆

راہِ عمل

مسلمانوں کی تعلیم میں ترقی کی ضرورت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

تعلیم متمدن انسان کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے جسمانی صحت کے لیے کھانا، موجودہ عہد میں مغربی قوموں کی تعلیم کے میدان میں فکر مندی ترقی اور نظم وانتظام پھر اس کے دور رس نتائج نکلنا سب کے سامنے ہے، ان کو دیکھ کر ہمارے پسماندہ مشرقی ممالک میں بھی اپنے لیے تعلیم کے بہتر نظم وانتظام کی ضرورت کا احساس بڑھا اور اس کے نتیجہ میں عصری مضامین کی درسگاہیں قائم کی گئیں اور کی جارہی ہیں، لیکن یہ عمل بڑے وسائل اور حسن انتظام اور فکر مندی کا طالب ہے، جس کی مسلمانوں میں کمی بھی ہے اور اس کے لیے توجہ بھی ابھی کم ہے بہر حال اس کے جو وسائل اور تقاضے اور جو دشواریاں ہیں وہ مسلم دانشوروں کی خصوصی توجہ کی محتاج ہیں اور ان کی مخلصانہ فکر پر بہتر نتائج کے حصول کا انحصار ہے۔

مسلمانوں کی قائم کردہ درسگاہوں میں ایک تو وہ درسگاہیں ہیں، جنھوں نے اپنے کو علوم دینیہ کی حفاظت اور ترویج کے ساتھ وابستہ کرلیا ہے، وہ عوامی چندوں سے اپنی مالی ضرورت کو پورا کرتی ہیں، اور اس میں اسلامی شعور رکھنے والے اہل ثروت اپنے اپنے جذبۂ دینی کے مطابق حصہ لیتے ہیں، یہ درسگاہیں امت کو علمائے دین اور مذہبی رہبر و مصلح فراہم کرتی ہیں جو امت اسلامیہ میں دین کی حفاظت اور اس کی زندگی کو دینی ضوابط کا پابند بنانے کی کوشش کا اپنا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

ان درس گاہوں کے متعدد اہم مسائل میں ایک اہم مسئلہ حکومت کی طرف سے ان کو تسلیم کرنے کا ہوتا ہے پھر تسلیم کیے جانے کے بعد ان کو ملت کی خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے چلانے کا اور آزادنہ عمل کرنے کا مسئلہ ہوتا ہے، دوسرے ان کے مالی تقاضوں کو پورا کرنے کا مسئلہ طالب توجہ بن جاتا ہے کیونکہ ان کے شعبوں کی وسعت اور ان کے لیے وسائل کی ضرورت، زیادہ مصارف کی متقاضی ہوتی ہے جو حکومت وقت کی مدد یا فیاض اور سخی اہل ثروت کے تعاون ہی سے پورے کیے جاسکتے ہیں، پھر ایسی تعلیم گاہوں کی ضرورت مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے جگہ جگہ قائم کیے جانے کی ہوتی ہے کیونکہ مسلمانوں کی تعداد ملک میں معتد بہ ہے اور ملک کے مختلف علاقوں میں پھیل رہی ہے، ان کی تعلیم کی ضرورت اور ان کی ضروری تعداد کو سامنے رکھتے ہوئے ان درس گاہوں کا قائم کرنا ایک ایسا عمل ہے جو حکومت کی مدد کے ساتھ قوم کے فراخدلانہ تعاون ہی سے ہوسکتا ہے وہ تنہا حکومت کی مدد کی صورت میں اپنی ملت کی خصوصیت کی مکمل بقا کے ساتھ نہیں ہوسکتا، اپنی ملی خصوصیت کی حفاظت کے ساتھ تعلیم چلانے کے لیے پرائیویٹ اداروں کا نظام ضروری ہوتا ہے اور مسلمانوں کے لیے ایک ایسے ملک میں جہاں وہ اقلیت میں ہیں یہ مسئلہ زیادہ اہمیت کا بن جاتا ہے، کیونکہ حکومت کے سیکولر ہونے اور مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے حکومت کا تعاون مسلمانوں کے ملی خصوصیات کے اداروں کو کم ہی حاصل ہوسکتا ہے، اس صورت میں خود اقلیت کو باہمت بننے کی ضرورت ہوتی ہے اور عزم وحوصلہ کے ساتھ اپنی ضرورت کے لیے خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا لازم ہوتا ہے اس میں اگر حکومت سے تعاون ملتا ہو تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ وہ تعلیم گاہ کے مقصد اور اس کی ملی خصوصیت کو متاثر نہ کرے بلکہ مسلمانوں کی علمی و فکری تشکیل کے ساتھ ان کی ملی خصوصیات کے پیدا کرنے کا ذریعہ ثابت ہو۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے زیر انتظام عصری تعلیم کے جو ادارے ہیں ملک کے سیکولر ہونے کی بنا پر اقلیتوں کو جو حقوق دیے گئے ہیں ان کی بنیاد پر یہ ادارے مسلم انتظام میں اور اپنی مرضی کے مطابق بڑی حد تک چلائے جاسکتے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ اگر حکومت سے مدد بھی ملتی یا مل سکتی ہے تو یہ ایک بڑی سہولت ہے جس سے مسلمانوں کو اپنے ملی تشخص کے ساتھ اپنے تعلیمی ادارے چلانے کا موقع ملتا ہے، لیکن اس کا انحصار مسلم انتظامیہ کے ارادہ اور صلاحیت پر ہے، کیونکہ ادارہ کی پالیسی کا تعین اور پھر اس پالیسی کا تحفظ نیز اسکے کاموں میں چستی اور مقصد کے مطابق کار کردگی، یہ سب ادارہ کی انتظامیہ کی توجہ وفکر مندی پر منحصر ہوتا ہے، اس طور پر پہلی ذمہ داری انتظامیہ پر آتی ہے، لیکن انتظامیہ کی توجہ وفکر مندی کا اصل فائدہ اس وقت ہوتا ہے جب انتظامیہ کے حضرات تعلیمی اداروں کی مشکلات اور ان کی

ضرورتوں کا پورا علم رکھتے ہوں اور اپنی ملت کی علمی ضرورت اور ملی تشخص کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہوں تاکہ اس کے مطابق وہ توجہ اور فکرمندی عمل میں لائیں اور وہ اس امر کا جواب دے سکتے ہوں کہ ان کے ملک بلکہ شہر میں دیگر متعدد اداروں کے ہوتے ہوئے مزید اس ادارہ کی ضرورت کیا ہے، آیا صرف تعداد میں اضافہ کرنے کے لیے یا اپنے ایک جدا رنگ و خصوصیت کے ساتھ ادارہ کو چلانے کے لیے، اور اگر جدا رنگ وخصوصیت کا ادارہ قائم کرنا ہے تو یہ کیوں اور کس مقصد سے قائم کرنا ہے؟

مسلمان انتظامیہ اس سیکولر ملک میں جب کوئی ادارہ قائم کرتی یا چلاتی ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اداروں کی تعداد میں صرف مزید اضافہ کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنی ملت کے مقصدِ حیات یا اپنے کلچر یا اپنی زبان کے تحفظ کے لیے قائم کرتی ہے اور علم وفن کے میدان میں اپنی امت کے فرزندوں کو نمایاں مقام تک پہنچانے کے لیے یہ قدم اٹھاتی ہے، مسلمان انتظامیہ کو اولا یہ بات سمجھنا ضروری ہے، پھر اس کے تقاضوں کے مطابق فکر وتوجہ سے کام لینا ہے۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے اداروں کو جب حکومت سے مدد ملتی ہے تو ان کے نصاب ونظام پر کچھ ضوابط بھی حکومت کی طرف سے عائد کیے جاتے ہیں، جو ادارہ کے مسلمان انتظامیہ کو پورا کرنا ہوتے ہیں، ان ضوابط کے دائرہ سے باہر دیگر متعدد پہلوؤں میں ادارہ کو مسلم انتظامیہ کی مرضی کے مطابق چلانے کا اختیار حاصل ہوتا ہے، ان کو اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے کا یہ اختیار ملک کے سیکولر دستوری رو سے حاصل ہوتا ہے، ان تعلیم گاہوں کا یہی وہ پہلو ہے جس کے رو سے مسلم انتظامیہ کو اپنے ملی و مذہبی تشخص کے ساتھ تعلیمی نظام کا بندوبست کرنے کی سہولت حاصل ہوتی ہے اور مسلمان طلبہ کو اپنی خصوصیات کو برقرار رکھنے اور مضبوط بنانے کا موقع حاصل ہو جاتا ہے، اور یہ بات چونکہ ان تعلیم گاہوں کو مسلم انتظامیہ کے توسط سے حاصل ہوتی ہے اس لیے ادارہ کو مفید طریقہ سے چلانے کی ذمہ داری اصلاً مسلم انتظامیہ پر جاتی ہے، اگر مسلم انتظامیہ اپنے اس حق کو فکر وتوجہ سے استعمال نہ کرے تو پھر مسلم انتظامیہ کے ہونے یا نہ ہونے میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا، اور جہاں تک مشکلات کا تعلق ہے تو اس سیکولر ملک میں مسلم انتظامیہ کے تحت جو ادارے چل رہے ہیں ان کے دو امور زیادہ قابل فکر ہیں، ایک تو یہ کہ انتظامیہ کے افراد میں یک جہتی اور تعلیم کے بڑے مقصد کے لیے اپنی شخصی رائے اور خیال کو آپس میں متحد رکھ کر چلانا کبھی کبھی خاصا مشکل بن جاتا ہے اور انتظامیہ کے ارکان کی رائے کا اختلاف بعض بعض وقت لافانی اختلاف بن جاتا ہے، اس اختلاف کی وجہ سے ادارہ کے بنیادی مصالح کو بڑا ضرر پہنچتا ہے اور ادارہ کمزور ہو کر مکمل کامیابی سے دور ہو جاتا ہے۔

دوسرا قابل ذکر مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ نظام تعلیم میں ملت کے مزاج اور اس کی ملی مصلحت کا لحاظ خاطر خواہ طریقے سے نہیں ہوتا، اس کمی کا اثر یہ ہوتا ہے، کہ نوجوان طلبہ کی تشکیل اسلامی ملت کے عین مقصد ومزاج کے مطابق نہیں ہو پاتی۔

بہر حال مسلم انتظامیہ والے اداروں کی کچھ دشواریاں تو انتظامیہ کی بعض کمزوریوں اور بے توجہیوں سے پیدا ہوتی ہیں اور کچھ کمزوریاں وسائل کی کمی کی بنیاد پر ہوتی ہیں، ان میں ایک دشواری جو اہم دشواری بھی ہے ادارہ کی ضرورت کے مطابق مالی فراہمی کا نہ ہونا ہے، وہ پرائیویٹ اور اقلیتی ادارہ ہونے کی وجہ سے حکومت سے اتنی مدد کے حق دار نہیں ہو پاتے جتنی ان کے اپنے مطلوبہ منصوبوں کو بخوبی چلانے کے لیے کافی ہو، چنانچہ اس مسئلہ کے حل کے لیے ان کو لامحالہ اپنی ملت کے اہل ثروت افراد کی طرف دیکھنا پڑتا ہے، اور یہ اہل ثروت افراد مسلمانوں کی ضرورت کی اہمیت کو اس طرح نہیں محسوس کر پاتے جس طرح ایک زندہ اور متحرک قوم کی ضرورتوں کو محسوس کرنا چاہیے، اس کمی کی وجہ سے ادارہ کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے، لہٰذا اس کے لیے ان حضرات کی ہمدردی حاصل کرنے کی طرف توجہ مبذول کرنے کی ضرورت ہے، اس کے لیے ان اداروں کے ذمہ داروں کو اپنی صلاحیتوں اور عملی کوششوں سے ملت کی اس ضرورت کی طرف جوان اداروں ہی سے پوری ہو سکتی ہے رابطہ بڑھانا چاہیے اور ان کے دل و دماغ کو اس ضرورت کے پورا کرنے کی طرف مائل کرنا چاہیے، ملت میں الحمد للہ ایسے اصحاب ثروت ہیں جو اس اہم ملی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں، ضرورت ہے کہ ملت کے بااثر افراد میں اس بات کا احساس بڑھے، اور وہ اپنی صلاحیتوں سے پورا پورا کام لیں اور اس فائدہ کو سمجھیں جو ان کی توجہ سے مسلم ملت کو پہنچ سکتا ہے۔

دوسرا پہلو جوان اداروں کا قابل توجہ ہے وہ تعلیمی وتدریسی نظام ہے، جس کے ذریعہ اساتذہ کو اپنے فرائض منصبی زیادہ سے زیادہ یاد دلانا اور

اس پر ان کو عامل بنانا ہے، تاکہ وہ طلبہ کو علم کے حصول میں یکسو ہو کر مشغول ہونے کی طرف متوجہ کریں اور ان میں جذبہ پیدا کریں خاص طور پر اس لیے بھی کہ اقلیت کے افراد کو زندگی کی دوڑ کے لیے زیادہ محنت و توجہ اور کام میں یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔

تیسرا پہلو نصاب تعلیم کا ہے، جو نصاب تعلیم ہماری ان تعلیم گاہوں کو انگریزوں کے زمانے سے ورثہ میں ملا ہے، وہ ابھی تک انگریزوں کے اختیار کردہ مقاصد کے دائرہ سے آزاد نہیں ہو سکا ہے، اس میں جو نظام تعلیم اختیار کیا جاتا ہے وہ نوجوان طالب علم کو عموماً ایک اچھا کلرک یا آفیسر یا مادی زندگی کے حصول ہی کی حد تک فائدہ پہونچانے کا کام دیتا ہے، ان نوجوانوں کو ملت کی صحیح فکر و ثقافت سے وابستہ اور ملت کی رہنمائی کی اصلی صلاحیت کا حامل اور ملت کے ملی تشخص و خصوصیت کا محافظ نہیں بناتا، سوائے چند ایسے افراد کے جو اپنے گھروں سے اپنی اعلیٰ قدروں کی تربیت حاصل کر کے ان اداروں میں آتے ہیں وہ تو اپنی اخلاقی و ثقافتی خصوصیات کو قائم رکھتے ہیں، اور پھر اس سے مستقبل میں ملت کو فائدہ پہنچاتے ہیں لیکن یہ تعلیم گاہیں اپنے نصاب سے ایسے اعلیٰ افراد پیدا نہیں کر پاتی ہیں جو علم و عمل میں ممتاز خصوصیات کے حامل ہوں، ان تعلیم گاہوں کے نصاب کا، خاص طور پر وہ حصہ جو زبان و ادب اور سماجی علوم سے تعلق رکھتا ہے ان خصوصیات سے عملاً خالی ہوتا ہے، جن کی ضرورت ایک مسلمان نوجوان کو اپنی ملت کی خصوصیت اور ضرورت کے مطابق اپنی شخصیت کی تشکیل کے لیے ہوتی ہے، اس نقص کی درستگی نصاب تعلیم کو خاص طور پر ادب و زبان اور سماجی اور انسانی علوم کو نئے سرے سے ڈھالنے اور ان کے مطابق کتابیں تیار کرنے کی ضرورت ہے، اور جب تک اس ضرورت کا نصاب تیار نہ ہو سکے اس وقت تک اہل نظر حضرات جاری شدہ نصاب کا مبصرانہ جائزہ لے کر ملت کی قدروں اور عقیدہ سے جوڑ نہ کھانے والی چیزوں کو نظر میں لائیں، اور نوجوان طلبہ کو اس سے واقف کرائیں تاکہ وہ کسی ناآہنگ بات سے بدگمان نہ کیے جاسکیں، اور اس کے ضرر سے بچ سکیں، اس کام کے لیے صاحب بصیرت اور صاحب واقفیت جو صحیح اسلامی شعور سے خالی نہ ہوں ان کی توجہ کی ضرورت ہے۔

ہماری تعلیم گاہوں کو وقت کی رفتار اور علوم کے بڑھتے ہوئے قافلہ پر بھی پوری نظر رکھنے کی ضرورت ہے، علم برابر ترقی اور توسع کی راہ پر چل رہا ہے، اور وہ اس وقت انسان کی ہر طرح کی ترقی کا ذریعہ بن گیا ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے ادارے نئی حاصل ہونے والی دریافتوں اور نئے پیدا ہونے والے اور ترقی کرنے والے علوم پر برابر نظر رکھیں تاکہ ہم ان کے سلسلہ میں پیچھے نہ رہ جائیں، اس کے لیے امت میں ایک روح بیدار کرنی ہوگی اور اہل مقدرت افراد کو ان ضرورتوں کو پورا کرنے میں تعاون کرنے کی طرف متوجہ کرنا ہوگا۔

دراصل مسلمان انتظامیہ رکھنے والی تعلیم گاہوں پر ایسے افراد ڈھالنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے جن کی موجودہ زمانہ میں قوم کی رہنمائی اعلیٰ سطح سے کرنے کے لیے ضرورت ہے، ان کے سامنے مسلمانوں کا وہ دور تاریخ کے صفحات میں نمایاں ہے جو قرون وسطیٰ میں جب کہ یورپ تاریکی اور جہالت کے دور سے گزر رہا تھا، اور مسلمان مفکر، معلم اور ماہرین علم و تمدن برابر پیدا ہو رہے تھے اور تاریخ میں اپنا مقام بنا رہے تھے جس کا یورپ کے مصنفین و مؤرخین بھی جگہ جگہ اعتراف کرتے ہیں کہ یورپ نے چھ سو سال تک ان مسلمانوں کی تحقیقات و علمی تفوق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ترقی کا آغاز کیا، ضرورت ہے کہ ہماری تعلیم گاہیں اور ماہرین تعلیم اپنے اس شاندار ماضی کو خود بھی پیش نظر رکھیں اور نوخیز نسلوں کو بھی اس سے واقف کرائیں تاکہ ان میں حوصلہ بڑھے اور ترقی کی راہیں ان کو معلوم ہوں، کوئی تعجب نہیں کہ وہ اس روشنی میں یورپ کی صرف برابری ہی نہیں بلکہ یورپ سے آگے بڑھ جائیں، ان کو یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ یورپ نے اپنی ساری ترقیات کے لیے صرف اپنی جسمانی اور مادی راحت کو مقصود بنایا ہے، اس نے اپنے دل ودماغ کو صرف ظاہری و سطحی مسرتوں کے لیے آزاد و بے مہار بنا رکھا ہے، لیکن مسلمان زندگی کے جائز پہلوؤں کو حاصل کرنے کے ساتھ انسانی قدروں کی حفاظت اور انسانیت نوازاخلاق کی تلقین کو بھی اپنا فریضہ سمجھتا ہے، اور اس کی تعلیم اس کو قرآن مجید اور حدیث شریف سے ملنے والے احکام الٰہی اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہوئی ہے اور اس کے ذریعہ اس کو انسانیت اور دنیا کی بہتر سے بہتر ترقی میں رہبرانہ کردار انجام دینے کی ہدایت ملی ہے، اور اس کے اسلاف نے اس پر عمل بھی کیا ہے، جس کی مثالیں امت کے ماضی کی تاریخ میں خاصی ملتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

علم وعمل

اسلام میں تعلیم وتربیت کا مقام

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

تعلیم وتربیت کا عمل گزشتہ ادوار میں ایک عبادت کی حیثیت رکھتا تھا، اور لوگ اس کو فضیلت وسعادت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے اور شریفانہ انسانی تعلقات کو مستحکم کرنے اور انسان کو اللہ سے جوڑنے کا ایک مضبوط ذریعہ قرار دیا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ ان عظیم شخصیتوں کے ذکر سے معمور ہے اور دنیا کی علمی تاریخ انہیں عظیم شخصیتوں کے فیض بے پایاں کا نتیجہ ہے اور انسانی زندگی کو بامقصد بنانے میں ان کا کردار بہت عظیم ہے، اگر ماضی کی طرف ایک نگاہ ڈالیں تو ہمیں انسانی زندگی میں مقصدیت کی روح پھونکنے اور نہایت وسیع پیمانہ پر خیر کو پھیلانے اور شر کو مٹانے کی مخلصانہ کوششیں نہایت واضح طور پر نظر آئیں گی، جہاں مال وجاہ اور منصب وکرسی کا کوئی گزر نہیں تھا اور تعلیم وتربیت کے پیشہ کو اختیار کرنے اور مثالی سیرت وکردار کے اعلیٰ ترین مقام تک پہونچنے کا حقیقی سبب یہی حصول علم کا سچا جذبہ تھا، اسی فطری بنیاد پر تعلیم وتربیت کا نظام وضع کیا جاتا تھا اور اس میں ہر چیز کی رعایت رکھی جاتی تھی، ماحول اور معاشرتی فضا، قوموں اور جماعتوں کے عقلی اور فکری معیار کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا اسی بناء پر تعلیم وتربیت کا حقیقی مقصد ماہرین تعلیم کی نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہونے پایا اور نصاب تعلیم کا نمایاں وصف مقصدیت کی روح ہوا کرتی تھی، اور دنیا میں بسنے والے تمام قوموں اور احساس ذمہ داری سے مزین انسانی معاشرے میں رہنے والے تمام عناصر یہاں تک کہ بڑی بڑی حکومتوں کا یہی مقصد ہوا کرتا تھا، اور یہی وہ ذریعہ تھا جس سے بین الاقوامی تعلقات مضبوط ہوتے تھے خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں، سیاسی، ثقافتی، تمدنی اور عالمی پیمانہ پر تمام قوموں کے درمیان اعتماد واعتبار کی فضا قائم ہوا کرتی تھی، اور کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ تعلیم وثقافت کے وسائل اور اس کے نظام کو ناپسندیدہ جذبات کے ابھارنے اور انتقام کی پیاس بجھانے کے لیے استعمال کیا گیا ہو اور نہ کبھی تجارتی سامان کی طرح اس کو بیچنے اور مارکیٹنگ کے لیے استعمال کیا گیا۔

لیکن انتہائی تعجب خیز اور غیر انسانی صورت حال یہ ہے کہ اسرائیل نے اپنے مقبوضہ علاقہ میں یہودی بچوں اور نوجوانوں کے لیے جو نصاب تعلیم مقرر کیا ہے، وہ عرب اور مسلمانوں سے بے حساب نفرت، بغض اور دشمنی کی بنیاد پر قائم ہے، حالانکہ علم وتہذیب اور سائنس اور ٹکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں ایسے خطرناک اور ناقابل قبول نصاب کو جاری کرنے کی کہیں بھی کوئی گنجائش نہیں ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسرائیل نے ایسے مبغوض نصاب تعلیم کو اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ رکھا ہے اور اس سے دستبردار ہونے کے بجائے ہر موقع پر اس کا مظاہرہ کرتا ہے، بعض قابل اعتماد شخصیتوں نے اس اسرائیلی نصاب تعلیم کا جائزہ لیا ہے اور اس کے بعض نہایت خطرناک پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے، ان میں سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ ہر اسرائیلی بچہ کے ایک کان میں یہ صور پھونکا جاتا ہے کہ یہودی پوری دنیا میں سب سے زیادہ بلند اور پسندیدہ شخصیت کے مالک ہیں، اور بچہ کے دوسرے کان میں امت عربیہ کے بارے میں نہایت ذلت آمیز اور رذالت سے بھرپور یہ آواز پہنچائی جاتی ہے کہ عرب قوم دنیا کی سب سے ذلیل ترین مخلوق ہیں اور کیڑے موڑے سے زیادہ ان کی حیثیت نہیں ہے، لہٰذا ان کو قتل کرنا انتہائی ضروری عمل ہے، جب یہودی بچہ اسکول جاتا ہے تو نصاب کی مقررہ کتابوں کے اندر یہ پڑھتا ہے کہ یہودی قوم اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ افضل اور عرب قوم سب سے زیادہ ذلیل اور نجس ہے، اور وہ ہر طرح کی عزت وشرافت سے عاری ہے، لہٰذا اس کو غلام بنانا اور ان کے ساتھ غلاموں کا معاملہ کرنا ایک لازمی قومی فریضہ ہے، اور جوں جوں یہودی بچہ اپنی تعلیم میں آگے بڑھتا جاتا ہے، اپنی نصابی کتابوں میں یہ پڑھتا ہے کہ عرب قوم ڈاکو ہیں، دہشت پسند ہیں، شر وفساد کے پھیلانے والے ہیں، ان کے آباء واجداد نے یہودیوں کو اس قدر نقصان پہونچایا کہ اس کی تلافی ناممکن ہے، اس بنا پر ان کے ساتھ برا سلوک کرنا عبادت کی ایک قسم ہے، اور جب بھی اس کی نصابی کتابوں میں لفظ عرب آتا ہے تو ان کا وصف بیان کیا جاتا ہے کہ وہ چور اور ڈاکو ہیں اور حلال کی اولاد نہیں ہیں، اور وہ اپنے آبا واجداد کے زمانہ سے یہودیوں کے خون کے پیاسے ہیں۔

نصابی کتابوں کے ذریعہ وہ اپنی اولاد کو فنون

حرب وضرب سے واقف کراتے ہیں، تاکہ وہ امت عربیہ سے انتقام لے سکیں، یہی وجہ ہے کہ سکنڈری اسکول کے مضامین پورے کرنے کے بعد ہر طالب علم کے لیے عسکریت کا سیکھنا لازمی (Compulsary) مضمون کی حیثیت رکھتا ہے، اور لازم ہوجاتا ہے کہ طلبہ اور طالبات عسکری تربیت اسرائیل ماہرین جنگ سے حاصل کریں، برطانیہ سے شائع ہونے والے ''انٹرنیشنل ہرالڈٹری بون'' اخبار نے اپنے ۱۸؍دسمبر ۲۰۰۴ء کے شمارہ میں ایک رپورٹ شائع کی، اس میں اسرائیل کے نصاب تعلیم کا جائزہ لیا گیا ہے اور جائزہ کی رپورٹ میں مذکور ہے کہ اسرائیلی نظام تعلیم وتربیت اور اس کا نصاب حد سے زیادہ خطرناک ہے۔

اس حقیقت کا پتہ لگانے کے لیے پاکستان کے معروف صحافی قدرت اللہ شہاب نے ایک غیر مسلم کی حیثیت سے اسرائیل کا دورہ کیا، وہ اقوام متحدہ کے ماتحت یونیسیف تنظیم کے ذریعہ وہاں پہونچے اور اسرائیلی نصاب تعلیم کی ان کتابوں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے جو مسلمانوں اور عربوں کے خلاف نہایت خطرناک مواد پر مشتمل ہیں اور ان کتابوں کو اقوام متحدہ کے ذمہ داروں کے سامنے پیش کیا، تاکہ اس کا تدارک کیا جاسکے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ کتابیں قصداً لاپرواہی اور غفلت کا شکار ہوگئیں اور اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکا، ظاہر ہے کہ وہ انسانی مسائل جو عرب اور اسلامی دنیا سے تعلق رکھتے ہوں کس طرح درخور اعتنا ہوسکتے ہیں، جب کہ بین الاقوامی سطح پر یہ طے ہوچکا ہے کہ اقوام متحدہ کا سکریٹری جنرل خواہ کوئی بھی ہو، لیکن اسسٹنٹ سکریٹری جنرل ہمیشہ اسرائیلی ہوگا، اور اس کو نائب سکریٹری جنرل لکھا اور کہا جائے گا۔

یہیں سے مغربی دنیا کی طرف سے اسلام کے نظام تعلیم وتربیت اور اس کے وسائل کو بدل رکھ دینے پر سخت اصرار اور دباؤ پایا جاتا ہے اور اس کو مغربی نظام تعلیم وتربیت کے مطابق وضع کرنے کی کوششیں نہایت شدومد سے جاری ہے، تاکہ عالم اسلامی کے مدارس اور جامعات میں ایک نئے نصاب تعلیم کو تشکیل دے کر اسے بلا تاخیر جاری کردیا جائے، اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے مغرب نے بہت پہلے سے اسلامی معاشروں اور سوسائٹیوں میں فکری حملے کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے تاکہ ان کو اصل شاہراہ سے ہٹا کر انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات کے بیج بوسکیں اور یہ ثابت کرسکیں کہ اسلامی نظام حیات اپنی صلاحیت کھو چکا ہے، فکری حملوں کا یہ طریقہ نہایت جارحانہ انداز میں وہاں کے تمام تعلیمی اداروں پر لازم قرار دیدیا گیا ہے۔

لیکن ہمیں از سر نو اسلام کے عادلانہ اور متوازن نظام زندگی کا جائزہ لینا چاہیے کہ وہ علم و عقیدہ اور اعمال واخلاق پر مبنی ہے اور وہ دائمی طریقے سے انسان کو قیادت کا اہل بناتا ہے اور ہر طرح کی خودغرضی اور مصلحت بینی سے دور ہے، پھر یہیں سے وہ امت وسط تیار ہوتی ہے جس کو پوری دنیا کے لیے شہادت وقیادت کی ذمہ داری عطا کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''ہم نے تم کو ایک امت عادل بنایا تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر اور رسول گواہ رہیں تم پر'' ۔[سورۃ بقرہ:۱۴۳]

یہی توازن اور وسطیت اسلامی تہذیب کا امتیاز ہے اور امت وسط (امت مسلمہ) اس کی علمبردار ہے اور اسی امتیاز کی بناء پر امت مسلمہ نے تمام قوموں اور دیگر امتوں پر زندگی کے تمام میدانوں میں اپنی فوقیت باقی رکھی اور گم کردۂ راہ انسانیت کو صراط مستقیم کی نعمت عطا کی، جب کہ مادی تمدن کے فلسفے عالمی حیثیت سے انسانی ذہن کو مسموم کرچکے تھے اور محض وقتی مفاد کو زندگی کا بنیادی مقصد باور کرانے میں کامیاب ہوچکے تھے اور سوسائٹی کی تعمیر اور انسان کے قائدانہ مستقبل کو روشن کرنے میں اس کا کوئی کردار باقی نہیں رہ گیا تھا، اس کے نتیجہ میں نوع انسانی کے مقام کا تعین مشکل ہوگیا کہ کس طرح وہ علوم وفنون، اجتماعیت اور معاشرتی انصاف اور مساوات کی نمائندگی کرے اور صرف مادی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں اپنی تمام طاقت کو صرف کرے اور اسی کو عزت وذلت کا معیار قرار دے، بالکل یہی صورت اسلام سے پہلے مشرق ومغرب کی مادی تہذیبوں میں قائم تھی اور اس میں ایسے واقعات پیش آئے جو تاریخ کے صفحات میں سیاہ کارناموں کی حیثیت سے درج ہیں، اور ان کو پڑھ کر انسان کی پیشانی شرم سے جھک جاتی ہے۔

اسلام نے علم اور تعلیم وتربیت کے تمام گوشوں اور اس کے شعبوں کو ایک نہایت پختہ بنیاد کا درجہ عطا کیا ہے، اور اسی پر اسلامی زندگی کی عمارت تعمیر ہوتی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلی وحی میں جس بات کا حکم دیا گیا وہ پڑھنے کا حکم تھا، اس کے باوجود کہ آپ امی تھے، جس کی صراحت اللہ تعالیٰ نے سورۂ جمعہ کی اس آیت میں فرمادی ہے:

''هو الذي بعث في الأميين رسولاً منهم يتلو عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة، وإن كانوا من قبل لفي

ضلال مبین“[جمعہ:۲](وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا، جوانہیں اس کی آیتیں پڑھ کرسناتا ہےاوران کو پاک کرتا ہےاورانہیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے یقیناًیہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے)۔

اور جب آپ غار حرا میں عبادت گزاری میں مشغول تھے، جبرئیل امین آپ کے پاس آئے اور آپ سے پڑھنے کی فرمائش کی، آپؐ نے فرمایا: میں پڑھنا نہیں جانتا، پھرانہوں نے حضورا کرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سینہ سے لگا کر پوری طاقت سے دبایا پھر چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھئے، میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا پھرانہوں نے دوبارہ مجھے پوری طاقت سے سینہ سے لگایا پھر چھوڑ دیا، پھر کہا: پڑھئے، میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا، انہوں نے تیسری بار یہی عمل کیا، اور کہا کہ پڑھئے اپنے اس رب کے نام سے جس نے انسان کوخون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھئے، آپ کا رب بڑا کرم والا ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی، جس نے انسان کو وہ سکھایا، جسے وہ نہیں جانتا۔

یہی وہ ہدایت یاب پڑھنا تھا جس کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا اور یہی پڑھنا علم کا وہ عظیم سرچشمہ بنا، جو زندگی اور کائنات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے اور تمام علوم ومعارف کی بنیاد ہے، اسی کے ذریعہ اللہ کی ذات تک پہونچنا اور زندگی کی تمام سرگرمیوں میں ان سے تعلق پیدا کرنا اور انسان کے کاندھے پر جو ذمہ داریاں رکھی گئیں ہیں ان کوادا کرنے کا راستہ عمل اور قیادت کے میدان میں ہموار ہوتا ہے، عالم اسلامی اور مسلم اقلیتوں کے مختلف ملکوں میں موجود تمام مدارس و جامعات کے لیے ماہرین تعلیم نے جو نصاب تعلیم وتربیت وضع کیا تھا وہ اسی صاف ستھری اور مضبوط بنیاد پر قائم ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مدرسہ اپنی ذات کے اعتبار سے بجائے خود چھوٹا موٹا معاشرہ ہے، جیسا کہ عطیہ محمد الابراشی نے اپنی کتاب فلسفہ تعلیم وتربیت میں مدرسہ کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

”مدرسہ سے بہتر طلباء کی اجتماعی تربیت کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہوسکتا، مدرسہ کی زندگی وہ سچی زندگی ہے جو گھر اور سوسائٹی کو ایک بناتی ہے، اور افراد اور سوسائٹی کا مفید عنصر بناتی ہے، خواہ طبقات اور ماحول کا کتنا اور کیسا ہی اختلاف کیوں نہ ہو“۔

وہ لکھتے ہیں: ”مدرسہ کی زندگی ہر روز طلباء کو ایسے وسائل فراہم کرتی ہے کہ وہ اجتماعی خوبیوں اور تقاضوں سے بہرہ مند ہوں، انہی خوبیوں کا اخلاق اور حسن معاملت پر گہرا اثر پڑتا ہے، اپنی عادات وخصائل کے اعتبار سے طلباء ہمیشہ اس کے محتاج رہتے ہیں کہ ان کی باقاعدہ نگہداشت اورنگہبانی کی جائے“۔

اس مقصد کو ہمہ گیر اور آسان بنانے کے لیے جن کتابوں اور لازمی مضامین کا انتخاب مسلم ماہرین تعلیم کی جانب سے عمل میں آیا، وہ اسلامی تشخص کی تعمیر کی ضمانت دیتا ہے، اور امت مسلمہ کے افراد کو عالم بشری کی قیادت وہدایت کی ذمہ داری کے لیے تیار کرتا ہے، چنانچہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس نصاب کی تشکیل میں بنیادی کردار ہے، اور اس میں کسی کمی اور زیادتی کی گنجائش نہیں، خواہ سیاسی واجتماعی مصالح اس میں ردوبدل کے متقاضی ہوں۔

نصابی مضامین میں تبدیلی سے متعلق موجودہ حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ اب نئی بنیادوں پر اعتماد کر کے عالم اسلامی کے تعلیمی مراکز میں اس کو بروئے کار لایا جارہا ہے، اور نیا نصاب تعلیم وضع کرنے کے لیے جو کمیٹیاں بنائی گئی ہیں وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ کتاب وسنت سے ان تمام آیتوں اور عبارتوں کو نکال دیا جائے، جن کا تعلق یہود ونصاریٰ اور جہاد کی اہمیت اور اس کے فضائل سے ہے، اسی طرح جن آیتوں اور عبارتوں میں باغی جماعتوں اور مشرکین کے خلاف جنگ کرنے کی دعوت دی گئی ہے، ان کو کالعدم کردیا جائے، اور جن باتوں سے جہاد فی سبیل اللہ کی ہمت افزائی ہو تی ہو، ان سے صرف نظر کیا جائے، اور جہاں کہیں مسلمانوں کی زندگی میں اخلاقی بلندی اور اس کے حدود اربعہ کو پھیلانے کا ذکر ہو، جس سے زندگی کے تمام معاملات میں اسلام کی عملی نمائندگی کا ثبوت ملتا ہو، ان کو نصاب کے مضامین سے پوری طرح خارج کردیا جائے، نصابی تبدیلی کے اس عمل کو قابل اعتنا سمجھنا اور اس پر اطمینان کا اظہار کرنا ایمانی عقائد سے دست بردار ہونے کے مرادف ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مصلحت پسندانہ سیاسی اسلام کو رواج دیا جائے، جس میں زمانہ اور حالات کے ساتھ ساتھ چلنے کی دعوت دی جاتی ہو، اس موقع پر اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور کا واقعہ ہماری نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے کہ جب مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کی تعداد ہاتھ کی انگلیوں سے زیادہ نہیں تھی، ان پر ہر طرح سے ظلم وعذاب کی بارش ہورہی تھی اور وہ ظالموں کے رحم وکرم پر زندگی گزار رہے تھے، لیکن ان کو یقین تھا کہ جس اسلام کو انہوں نے اختیار کیا ہے، وہ کبھی ان کو رسوا نہیں کرے گا اور اللہ کی طرف سے مدد آکر رہے گی، اس کے باوجود جن حالات نے ان کو گھیر رکھا تھا وہ آخری درجہ کے ظلم وقساوت تک پہنچ گئے تھے، اور

دعوت کی مصلحت کا تقاضہ یہ تھا کہ سر دست مسلمان کفار کو اسلام کی دعوت نہ دیں، اور ان کے تمام مشرکانہ انداز کو خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہیں اور اللہ تعالیٰ سے نجات اور رحم کی درخواست کرتے رہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ وہ توحید کی دعوت پر کبھی خاموشی اختیار نہ کریں، اور شرک و وثنیت کو انجام کی پرواہ کیے بغیر مسترد کرتے رہیں، حالانکہ شرک اور بت پرستی کے داعی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے متبعین پر ہر طرح کے ظلم وزیادتی جاری رکھنے پر تلے ہوئے تھے، اسی دوران وحی نازل ہوتی ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ کفار کو مخاطب کر کے صاف صاف اور نہایت تاکید کے ساتھ یہ بتا دیا جائے کہ وہ بتوں کی عبادت کبھی نہیں کریں گے، صرف اللہ واحد قہار کی عبادت کریں گے، سورہ کافرون نازل ہوئی اور اس نے اصنام پرست اور وثنیت کی دعوت دینے والوں کو چیلنج کرتے ہوئے نہایت صراحت کے ساتھ اعلان کیا کہ مسلمانوں کا دین ان کے دین کی طرح نہیں ہے، جس کو انہوں نے بزعم خود دین سمجھ لیا ہے، اس وقت آپ سورہ کافرون کی تلاوت کریں اور اس کے مفہوم ومعنی کو بغور سمجھنے کی کوشش کریں:

"قل يا أيها الكافرون، لا أعبد ما تعبدون، ولا أنتم عابدون ما أعبد، ولا أنا عابد ما عبدتم، ولا أنتم عابدون ما أعبد، لكم دينكم ولي دين" (کہہ دیجیے کہ اے کافرو! نہ میں عبادت کرتا ہوں اس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو، نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں عبادت کروں گا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں عبادت کر رہا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے)۔

تنہا یہی آیتیں اللہ تعالیٰ کے دین اسلام سے کسی حد تک بھی دستبردار ہونے کی برأت کا اعلان نہیں کرتیں، بلکہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دونوں، کسی فرد اور جماعت کو جو اہل ایمان اور صحیح عقیدہ رکھنے والے ہوں اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ میں کسی قسم کا اختیار استعمال کریں، اس لیے کہ حالات اس کے متقاضی ہیں، یہ حقیقت ہے کہ کسی کو اللہ کے فیصلہ میں تصرف کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، بلکہ قاعدہ کلیہ یہ ہے کہ اسلام کے ہر حکم کو بے خوف وخطر تسلیم کیا جائے، اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے تمام معاملات کی تابعداری کلی طور پر اختیار کی جائے، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب ایک ایماندار اپنی زندگی اور معاشرہ کے تمام معاملات میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کے سامنے سرنگوں ہے، اور اس میں اس کو کسی تصرف کا اختیار نہیں ہے، تو ایمان و عقیدہ کے معاملات میں دستبردار ہونا اور اس میں کسی قسم کی کمی وزیادتی کرنا کس طرح ممکن ہے۔

آج اسلامی ملکوں کے مدارس وجامعات کے نصاب تعلیم میں ایک محسوس تبدیلی کا مطالبہ کیا جارہا ہے، اور کتاب وسنت کی آیتوں اور عبارتوں میں تصرف کرنے کا حق دیا جارہا ہے، اور مغربی نئی ہدایات کی روشنی میں نصاب تعلیم وتربیت تیار کرنے کا حکم دیا جارہا ہے مگر یہ مطالبہ اسلام کی بنیادی تعلیمات سے کسی حال میں ہم آہنگ نہیں ہے، اور سچی بات تو یہ ہے کہ اصل بنیاد سے دستبردار ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اسلامی تہذیب کی عمارت سطح زمین پر قائم ہے، اور اس کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے، اور کسی بھی ادنیٰ واقعہ سے متاثر ہوکر وہ روئے زمین پر ڈھیر ہوسکتی ہے۔

دین کے معاملات میں کسی بھی دستبرداری کا سرچشمہ ایمان کی کمزوری کی علامت ہے یا عقیدہ کو پامال کرنے کے مرادف ہے، اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس امانت کو اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تھا، اور انہوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کیا تھا، اس امانت کی ذمہ داری کو انسان نے قبول کیا تھا، لیکن اب وہ اس ذمہ داری کو پوری کرنے سے انکار کر رہا ہے، حالانکہ عقیدہ کے مطالبات کو نظر انداز کرنے اور مصلحت کو پیش نظر رکھنے سے قرآن کریم سے بہت سی سورتوں اور آیتوں کو حذف کرنے اور کتاب وسنت کے احکام واوامر سے صرف نظر کا راستہ ہموار ہوتا ہے، اور اس بات کا جواز فراہم ہوتا ہے کہ قرآن کریم اور حدیث شریف کے مختصر ایڈیشن تیار کر کے پیش کر دیا جائے، تاکہ ان کو اسلامی اور غیر اسلامی معاشروں کے درمیان پہونچانا آسان ہو، اور مکمل اسلام لوگوں کے گھروں اور ان کی زندگیوں سے غائب ہوجائے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو حکم دیتے ہیں اور فرماتے ہیں:

"يا أيها الذين آمنوا ادخلوا في السلم كافة، ولا تتبعوا خطوات الشيطان، إنه لكم عدو مبين" (اے ایمان والو! اسلام میں سارے کے سارے داخل ہوجاؤ، اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو، کیونکہ وہ تمہارا صریح دشمن ہے)۔ [سورۃ بقرہ: ۲۰۸]

☆☆☆☆☆

اخلاص نیت

قدیم نظام تعلیم کی خصوصیات

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''قدیم نظام تعلیم نقائص اور کمزوریوں سے مبرا نہیں تھا، فنی لحاظ سے اس کے متعدد پہلو قابل تنقید واصلاح ہیں، لیکن جو لوگ اس نظام کے بانی اور ذمہ دار تھے، ان کے مزاج اور اس دینی روح کی بنا پر جو اس کے اندر سرایت کیے ہوئے تھی، وہ بعض خصوصیات کا حامل تھا، جو اب جدید تعلیمی نظاموں میں مفقود ہیں اور یہ خصوصیات نسل درنسل معلمین اور ان کے شاگردوں میں منتقل ہوتی رہیں''۔ [ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ، ص ۱۱۷-۱۱۸]

اخلاص وایثار

قدیم اساتذہ کا سب سے بڑا امتیاز اور ان کا شعار اخلاص وایثار تھا، چونکہ تعلیم وتعلم کا اخروی ثواب اور استاد ومعلم کی دینی فضیلت ان کے ذہن پر نقش تھی اور ان کا عقیدہ اور جزو ایمان بن چکی تھی، اس لیے ان میں اگر سب نہیں تو بہت بڑی تعداد محض رضائے الٰہی اور حصول اجر وثواب کے لیے تعلیم وتعلم میں مشغول تھی اور اس کو افضل عبادت اور اعلیٰ سعادت سمجھتی تھی، ان اساتذہ میں بہت سے حضرات زہد وقناعت کے ساتھ بسر کرتے تھے اور فقر وفاقہ میں زندگی گزارتے تھے، علمائے ہند کے تذکرہ کی قدیم کتابوں میں ان اساتذۂ کبار کے زہد وایثار اور فقر وفاقہ کے بڑے مؤثر اور دلدوز واقعات ملتے ہیں، یہاں ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

''مولانا عبد الرحیم [متوفی ۱۲۴۴ھ] رام پور میں درس دیتے تھے، روہیل کھنڈ کے انگریز گورنر مسٹر ہاکنس نے ان کو بریلی کالج کی تدریس کے لیے ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ کی (جس کی قیمت آج سے ڈیڑھ صدی قبل دو ہزار سے زیادہ تھی) پیش کش کی اور وعدہ کیا کہ تھوڑی مدت میں اس مشاہرہ میں اور اضافہ کردیا جائے گا، انہوں نے اس منصب کو قبول کرنے سے معذرت کردی اور اپنے پرانے مدرسے ہی میں باقی رہنے پر اصرار کیا اور کہا: ''تعلیم پر اجرت لینے کے متعلق میں قیامت میں اللہ کو کیا جواب دوں گا''۔ [حوالہ مذکور، ص ۱۱۹]

درس میں انہماک

ملا عبد القادر بدایونی اپنے استاد مولانا عبد اللہ بدایونی کے متعلق لکھتے ہیں کہ اپنے گھر کا سودا خود خریدنے بازار جایا کرتے تھے، طلبہ کی جماعت ہمراہ ہوتی تھی اور وہ سبق پڑھاتے رہتے تھے''۔ [منتخب التواریخ، ص:۵۶]

اس سے اساتذہ کا اپنے طلبہ سے گہرے تعلق کا پتہ چلتا ہے، لہٰذا اساتذہ کو اپنے شاگردوں اور طالب علموں سے ایسا گہرا اور شدید تعلق ہوتا تھا جس کی مثال اس زمانہ میں اور موجودہ نظام تعلیم میں ملنی مشکل ہے، اساتذہ طلبہ کو اولاد کی طرح عزیز رکھتے تھے، اکثر اوقات ان کے متکفل ہوتے تھے، ان کو خورد ونوش میں شریک کرتے تھے، عہد اکبری کے شاہی طبیب اور مشہور مدرس حکیم علی گیلانی کے متعلق ''تذکرہ علماء ہند'' میں لکھا ہے کہ: ''ہمیشہ طلبہ کو درس دیتے اور بغیر ان کے کھانا نہ کھاتے''۔

طلبہ کا اساتذہ سے تعلق

طلبہ کا بھی اپنے اساتذہ سے ایسا تعلق تھا جو سعادت مندی، روحانی تعلق اور قلبی وابستگی کی ایک مثال ہے، ایک واقعہ یہاں اس سلسلہ میں نقل کیا جاتا ہے۔

ایک مرتبہ استاد العلماء ملا نظام الدین فرنگی محلی کے انتقال کی خبر مشہور ہوگئی، اس کا اثر ان کے ایک شاگرد سید ظریف عظیم آبادی پر یہ پڑا کہ روتے روتے آنکھیں جاتی رہیں، دوسرے شاگرد سید کمال الدین عظیم آبادی تو اس صدمہ کی تاب نہ لاسکے اور انتقال کرگئے، بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اطلاع غلط تھی، طلبہ اور اساتذہ کا تعلق اس قدیم نظام تعلیم کا طرۂ امتیاز تھا۔

شاہانِ وقت اور رؤساء کی قدردانی

قدیم تعلیمی عہد کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ سلاطین زمانہ اور امراءِ نامدار اساتذہ کرام اور جلیل القدر علماء کی خدمت اور راحت کو اپنی سعادت اور اپنے لیے نجات اور فلاح کا وسیلہ سمجھتے تھے، ہندوستان کی اسلامی عہد کی تاریخ نے ان سلاطین وامراء کی قدردانی وقدرشناسی واعتراف کمال کی کثرت سے مثالیں پیش کی ہیں۔

امیر فتح اللہ شیرازی کے انتقال پر اکبر نے ان لفظوں میں اپنے دلی تاثر وتاسف کا اظہار کیا:

''اگر فرنگی ان کو قید کرتے اور میرا تمام خزانہ

سلطنت ان کے فدیہ میں مانگتے تو یہ سودا بڑا سستا اور فائدہ مند ثابت ہوتا اور یہ گوہر عالی اس قیمت میں بھی ارزاں ہوتا''۔

صاحب ''اغصان اربعہ'' مولانا ولی اللہ فرنگی محلی نے مولانا بحر العلوم کے مدراس میں شاہانہ استقبال کی تصویر اس طرح کھینچی ہے:

''جب پالکی شاہی محل کے قریب پہونچی تو آپ نے اترنا چاہا، نواب والا جاہ نے اشارہ کیا کہ تشریف رکھیں اور خود پالکی کو کاندھا دے کر محل میں لائے اور مسند شاہی پر اپنی جگہ بٹھایا، قدم بوسی کی اور کہا کہ میرے ایسے نصیب کہاں تھے کہ آپ قدم رنجاں فرمائیں اور میرے مکان کو منور کریں''۔

اصلاح باطن اور اہل دل سے تعلق

اس قدیم نظام تعلیم اور اس کے رہنماؤں اور ذمہ داروں کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ تھی کہ ان کو اپنے علمی تبحر، مہارت فن، مرجعیت اور شہرت وعظمت کے اوج کمال پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے باطن کی اصلاح، نفس کے تزکیہ اور نسبت مع اللہ پیدا کرنے کی طرف بھی پوری توجہ تھی، وہ جہاں علوم ظاہری کی تحصیل کے لیے کامل الفن اساتذہ اور متبحر علماء کی خدمت اپنا فرض سمجھتے تھے، وہاں بزرگان دین اور اولیاء کرام کی خدمت بھی اپنی تکمیل کے لیے ضروری سمجھتے تھے، اس میں ان کی شہرت اور وجاہت قطعاً حارج نہیں ہوتی تھی۔

یہ بات بھی بڑی سبق آموز اور نظر افروز ہے اور اس کو محض اتفاق پر محمول نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور کے اکثر علماء و اساتذہ کو اپنے زمانہ کی ان روحانی شخصیتوں سے وابستگی رہی ہے، علم کے وفور اور مطالعہ و تحقیق کے سرور کے ساتھ ساتھ اپنی باطنی ضروریات اور تشنگی کا احساس اور ان کی تکمیل کا تقاضہ علم کے قالب میں اخلاص اور تعلق مع اللہ کی روح پیدا کرنے کا ولولہ اس قدیم نظام تعلیم کا ایک روشن پہلو ہے جس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ اس نظام کے ذمہ دار علماء و اساتذہ کا عوام سے زیادہ ربط و تعلق ہوتا تھا اور وہ ان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے تھے، دوسرا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے زمانہ کی مادی تحریکات و ترغیبات، سلاطین و حکام سے تعلق و تقرب کے مواقع اور بہت سی اخلاقی کمزوریوں سے محفوظ رہتے تھے جن سے محض علم اور ذہانت کی بنا پر محفوظ رہنا مشکل ہے۔

درس نظامی پر ایک نظر

مختلف زمانوں میں درس نظامی کے نصاب میں تبدیلی ہوتی رہی اور حالات کے اعتبار سے اس نصاب درس سے بعض کتابیں خارج کی گئیں اور بعض کتابوں کا اضافہ کیا گیا، لیکن نظام تعلیم کے بنیادی ڈھانچہ میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہو سکی، چنانچہ ہر زمانہ میں طلبہ کی صلاحیت اور حالات کے تقاضوں کے مطابق علوم وفنون کے درمیان حسین امتزاج قائم رہا، ہر دور میں ایسے اساتذہ میسر رہے ہیں جنہوں نے اپنے محنتی اور ذہین طلبہ کے لیے مخصوص نصاب درس مقرر کیا، ان کے لیے کتابیں لکھیں اور مسائل کی تلخیص کی، اس انفرادی جدوجہد سے طلبہ کی صلاحیتوں میں نکھار اور روح میں بالیدگی پیدا ہوئی، تاریخ کا کوئی بھی زمانہ ایسے اساتذۂ فن اور متبحر علماء سے خالی نہیں رہا، قدیم نظام تعلیم کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب یہی تھا، لیکن آج کا موجودہ نظام تعلیم جس نے قدیم شخصی نظام تعلیم کی جگہ لے لی ہے، اس میں استاد و شاگرد کے درمیان خلیج کے پیدا ہو جانے، اساتذہ کی کثرت، مدرسہ کے نظام اور اصول وضوابط کی پابندی کی وجہ سے اپنی افادیت ثابت نہیں کر سکتا ہے، دوسرا قابل توجہ امر جو قدیم نظام تعلیم میں بھی بڑی اہمیت کا حامل تھا، وہ علم کی پاکیزگی، اس کا تقدس، اساتذہ کا احترام اور حصول علم کا سچا شوق ہے جو آج کے اس دور میں جہاں مادیت کی حکمرانی ہے اور علم کو کسب معاش کا ایک کارگر ذریعہ بنا لیا گیا ہے، عنقا نظر آتا ہے، جبکہ ماضی میں اس نظام کے فارغ اساتذہ فن بلند مناصب کے قبول کرنے سے گریز کرتے تھے۔

اسلام کی علمی تاریخ کے عجیب وغریب اتفاقات میں سے یہ بھی ہے کہ جب جب علوم عقلیہ کا انسانی عقل وفکر پر غلبہ ہوا، اساتذہ، طلبہ اور امراء وسلاطین میں دینی واخلاقی قدروں کا احترام رخصت ہوا اور علم کو بحیثیت ایک فن اور پیشہ کے اختیار کیا گیا اور مخلص علماء وسلاطین کے رشتوں میں سرد مہری پیدا ہوئی تو حکام کی عوام پر بالادستی اور اثر ورسوخ کمزور پڑ گیا اور انتظامیہ اضمحلال وانحطاط کا شکار ہو گئی۔

اخیر کی صدیوں میں خاص طور پر اسلامی نظام حکومت کے زوال اور برطانوی حکومت کے قیام کے بعد نظام تعلیم کے انحطاط کے اسباب کیا تھے؟ ان کو تلاش کرنا چاہیے اور یہ معلوم کرنا چاہیے کہ صلاحیتوں میں جمود وتعطل کے اثرات کیسے نمودار ہوئے اور علماء میں جمود کیسے پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں زندگی کے ہر میدان میں تقلید عام ہو گئی، قدیم عقلی علوم غالب آ گئے اور تعلیم کے دو مختلف نظام وجود میں آئے۔

درس نظامی کے فوائد ونقصانات

تیرہویں صدی ہجری کا زمانہ وہ ہے کہ جب اقتدار مسلمانوں سے منتقل ہو کر انگریزوں کو حاصل

ہوا، اس وقت مسلمانوں کی طاقت محض ہندوستان کے چند شہر اور لال قلعہ میں منحصر تھی جب کہ انگریزوں کا اقتدار اور ملکی سیاست میں ان کی مداخلت روز بروز بڑھتی جارہی تھی، دوسری طرف امت اسلامیہ کو ہندوستان میں اقتصادی، اخلاقی، فکری اور عقائدی فتنوں کا سامنا بھی تھا ان پرخطر حالات میں ایک طرف علماء ربانیین اسلام کی بقاوتحفظ اور اسلامی اقتدار کی بازیافت اور مسلمانوں کو سلف صالحین کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین میں مشغول تھے، تو دوسری طرف علماء کی ایک بڑی تعداد فلسفہ کے مباحث الٰہیات اور علوم عقلیہ کی وجہ سے کلامی موضوعات میں اپنا وقت صرف کررہی تھی، چنانچہ حدیث وتفسیر اور روحانی تربیت میں کلامی چھاپ پائی جاتی تھی، اس منطقیانہ استدلالات اور فلسفے کے اثرات، علماء کی سیرت وکردار اور ان کے انداز تربیت میں نظر آتے ہیں، ایرانیوں کے غلبہ کی وجہ سے سیاسی انحطاط کے زمانہ میں امراء وسلاطین کے نزدیک دخیل علوم کی مقبولیت کے سبب علماء علوم نقلیہ کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے، چنانچہ علماء علوم عقلیہ کی کتابوں کی شرح وتلخیص اور نئی کتابوں کی تالیف و تبویب میں مشغول ہوگئے، اس طرح متقدمین کی کتابوں کے ساتھ ساتھ متاخرین کی بھی کتابیں داخل نصاب ہوگئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم عقلیہ کے نصاب میں درسی کتابوں کی تعداد کافی بڑھ گئی اور منطق کی کتابیں مع شروح کے پندرہ تک پہونچ گئیں، جبکہ تفسیر میں صرف دو کتابیں اور بلاغت میں بھی صرف دو کتابیں باقی رہیں، فلسفیانہ مسائل کی آمیزش کی وجہ سے علماء متاخرین کی تالیف کردہ کتابوں میں تکرار، خلط مبحث اور غموض وابہام پیدا ہوا، ایک بڑا نقص اس نصاب درس کا یہ بھی تھا کہ اس میں تاریخ، جغرافیہ، علم اعجاز القرآن اور دیگر اہم علوم کی جس سے ذہن وفکر میں وسعت اور خیال میں بلندی پیدا ہوتی ہے، ایک کتاب بھی شامل نصاب نہ تھی، حالانکہ یہ علوم طالب علم کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ خود اپنی ذات اور اپنے معاشرہ کے تئیں مفید ہوتا ہے، اور ضروریات زمانہ کی تکمیل پر قادر ہوتا ہے۔

جہاں تک اس نصاب تعلیم میں ادب کا تعلق ہے تو وہ انتہائی درجہ کا فرسودہ اور قدیم تھا کیونکہ اس میں نفحۃ الیمن، معلقات، مقامات حریری، دیوان متنبّی اور حماسہ ہی پڑھائی جاتی تھی، ایسا اس لیے تھا کہ اس نظام کے وضع کرنے والوں کے نزدیک ادب کا تصور بہت محدود تھا، ان کے خیال کے مطابق ادب چند الفاظ کے یاد کرلینے کا نام ہے نہ کہ انسانی زندگی کی ترجمانی اور اس کے جذبات احساسات کی تصویر کشی کا، یہی وجہ تھی کہ اس نصاب درس میں حل لغات پر اور نحو وصرف کے مسائل کے استشہاد پر زیادہ توجہ تھی، عبارت میں موجود بلاغی حسن وجمال اور عالمانہ تنقید وتدقیق پر توجہ نہ دی جاتی تھی، اسی لیے اس نصاب کے فارغین میں ادبی ذوق، تحریر وتقریر کا ملکہ اور موجودہ طرز نگارش کا جمال پیدا نہ ہوسکا، جس کے نتیجہ میں تعبیر وبیان میں ابہام وتعقید اور فکری جمود وتعطل پیدا ہوگیا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ادب کی مذکورہ کتابیں تمام مدارس میں داخل نصاب نہ تھیں، بلکہ بعض مدارس میں صرف نفحۃ الیمن اور مقامات حریری پڑھائی جاتی تھی اور بعض مدارس میں دیوان متنبّی کا اضافہ تھا اور بعض میں معلقات اور حماسہ بھی داخل نصاب تھی، رہی منطق اور نحو وصرف اور فقہ واصول فقہ کی کتابیں تو وہ تمام مدارس میں یکساں طور پر داخل نصاب تھیں، اور حدیث شریف کی تعلیم و تدریس میں فقہی رنگ غالب تھا۔

☆☆☆☆☆

مجلس صحافت ونشریات کی جدید ودیدہ زیب طباعت

فتاویٰ ندوۃ العلماء (جلد چہارم)

مکمل صفحات: ۴۱۶ قیمت: ۴۰۰؍روپے

مجلس صحافت ونشریات

ٹیگور مارگ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

موبائل نمبر: 9415515578, 9889664104

ای میل: ahmadniyaz7893@gmail.com

اسوۂ حسنہ

ابلاغِ دعوت-اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں

محمد ارشاد الرحمٰن

نبوت و رسالت انسانیت پر اللہ تعالیٰ کا عظیم ترین احسان ہے، یہی وہ واحد محفوظ اور قطعی ذریعۂ ہدایت ہے جس کی بنا پر انبیائے کرام دوٹوک انداز میں بتاتے رہے کہ ایک اللہ کی عبادت ہی انسانیت کا مقصد اور راہ نجات ہے، تمام انبیائے کرام کی دعوت ایک رہی۔ خاتم النبین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ما يقال لك الا ما قد قيل للرسل من قبلك [حم السجدہ ۴۱:۴۳] (اے نبیؐ! تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو)۔

نزول قرآن مجید کے ابتدائی ور میں توحید، آخرت اور حضرت محمد کی نبوت و رسالت کے دلائل پر خصوصی ارتکاز رہا، نبوت محمدیؐ پر لوگوں نے جس جس نوعیت کے اعتراضات وارد کیے ان کا جواب بھرپور اور قطعی انداز میں دیا گیا، معترضین نے نزول قرآن کو جنات وجنون کا اثر اور شعر و شاعری کا نتیجہ کہا اور حضرت محمدؐ کا خود ساختہ کلام قرار دیا (نعوذ باللہ)۔

کلام الٰہی قرآن مجید نے ان تمام باتوں کو ایسی شدت اور قطعیت کے ساتھ مسترد کیا کہ انبیاء اور رسل کی صداقت پر اس سے بڑی کوئی شہادت نہیں ہوسکتی، ایسی آیات میں جہاں نبی کریمؐ کی نبوت و رسالت کو برحق قرار دیا گیا وہاں نبوت کے ابلاغ کی ذمہ داری کی ادائیگی میں آپؐ کی عصمت و عفت اور امانت و دیانت کو بھی پورے زور سے بیان کیا گیا، یہ مضمون سورۂ شوریٰ [۴۲:۲۴] اور سورۂ حاقہ [۶۹: ۳۸-۵۲] میں نزول قرآن کی غرض یہ بیان کی گئی کہ نبی کریمؐ انسانوں کی تاریکی اور ظلمت سے نکال کر روشنی میں لائیں گے، فرمایا: "هو الذى ينزل على عبده آيت بينت ليخرجكم من الظلمت الى النور، وان الله بكم لرؤوف رحيم" [الحدید ۵۷:۹] (وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے تاکہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم بھی ملا کہ اس وحی شدہ قرآن کو مضبوطی سے اختیار کرنا اور اس کے تقاضوں کو کما حقہ پورا کرنا آپؐ کی ذمہ داری ہے، اور اس ذمہ داری کی جواب دہی بھی ایک روز آپؐ کو اور آپؐ کی قوم کو کرنا ہوگی: "فاستمسك بالذى اوحى اليك، انك على صراط مستقيم، وانه لذكر لك و لقومك، وسوف تسئلون" [الزخرف ۴۳:۴۳-۴۴] (تم بہر حال اس کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہو جو وحی کے ذریعے سے تمہارے پاس بھیجی گئی ہے، یقیناً تم سیدھے راستے پر ہو، حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے ایک بہت بڑا اشرف ہے اور عنقریب تم لوگوں کو اس کی جواب دہی کرنی ہوگی)۔

وحی پر قائم رہنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے احکام کے ساتھ ہی اس کے ابلاغ کا حکم بھی پوری تاکید کے ساتھ دیا گیا: "يا ايها الرسول بلغ ما انزل اليك من ربك، وان لم تفعل فما بلغت رسالته" [المائدۃ ۵:۶۷] (اے پیغمبرؐ، جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، وہ لوگوں کو پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا)۔

ابلاغ کا حکم اور اس کی نبوی تعمیل

دوسری وحی میں سورۃ المدثر کی ابتدائی ۷ آیات نازل ہوئیں، ان میں رسول کریمؐ کو تبلیغ دین کا حکم دیا گیا، یہ حکم بہت مختصر مگر نہایت جامع الفاظ میں تھا، فرمایا: "يا أيها المدثر، قم فأنذر، وربك فكبّر" [المدثر ۷۴:۱-۳] (اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبردار کرو، اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو)، رسول کریمؐ نے ابلاغ وحی کے اس حکم کی تعمیل میں جدوجہد کا آغاز فرمایا تو پھر اس راہ کی مشکلات کو دیکھا نہ ذاتی ضروریات کا خیال رکھا، انسانوں کو راہ راست پر لانے کے لیے دن رات ایک کر دیا، پیغمبرانہ زندگی کے ۲۳ برس میں سے پہلے تین برس خفیہ اور پس پردہ دعوتی جدوجہد میں گزرے۔

چوتھے سال سے نبوت کے دسویں سال تک مکہ میں کھلی اور علانیہ دعوت و تبلیغ کی سرگرمیاں جاری رہیں، دسویں سال نبوت سے تیرھویں سال نبوت، یعنی ہجرت مدینہ تک مکہ سے باہر دعوت کے ابلاغ اور پھیلاؤ کے لیے کاوش جاری رہی، پھر ہجرت سے وصال نبویؐ تک پورے ۱۰ سال بین الاقوامی سطح پر دعوت دین کا سلسلہ جاری رہا جس میں بیش تر عرصہ جہادی سرگرمیوں پر مبنی جدوجہد میں گزرا۔

علانیہ دعوت کا حکم اور قوم کا رد عمل

تین سال تک تبلیغ کا کام خفیہ اور انفرادی رہا، اس

کے بعد آپ کو مکلّف بنایا گیا کہ قوم کو کھلم کھلا دین کی دعوت دیں، ان کے باطل سے ٹکرائیں اور ان کے بتوں کی حقیقت واشگاف کریں، اظہار دعوت کا پہلا حکم وأنذر عشيرتك الأقربين کے الفاظ میں دیا گیا، اس پر عمل کے لیے آپ ؐ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کے ایک ایک قبیلے کا نام لے کر آواز لگائی اور جب تمام لوگ جمع ہو گئے تو دعوت پیش کی، یہی وہ موقع ہے جب ابولہب نے آپ کو بدزبانی کا نشانہ بنایا۔

اس کے بعد قریش فوراً رسول اللہ ؐ کی راہ روکنے کے لیے کمر بستہ ہو گئے، آپ ؐ پر تشدد بھی روا رکھا جانے لگا، علانیہ دعوت کے بعد حج کا موسم قریش کے لیے اپنے اندر خطرناکی لیے ہوئے تھا۔

لہٰذا انھوں نے حجاج کو اس دعوت سے دور رکھنے کے لیے مشاورت کی اور آپ ؐ کے خلاف متفقہ رائے یہ قائم کی گئی، آپ ؐ کو (معاذ اللہ) مجنون قرار دیا جائے، اس نام سے آپ ؐ کو براہ راست بھی پکارا گیا اور زائرین کعبہ کو بھی یہی فریب دینے کی کوشش کی گئی، ہنسی، ٹھٹھا، تحقیر، استہزا اور تکذیب کے تمام ہتھکنڈے استعمال کیے گئے، گالیوں تک کا آپ ؐ کو نشانہ بنایا گیا، آپ ؐ کی تعلیمات کو مسخ کرنا، شکوک و شبہات پیدا کرنا، جھوٹا پروپیگنڈا کرنا، تعلیمات سے لے کر شخصیت تک کو واہیات قسم کے اعتراضات کا نشانہ بنانا قریش کا معمول تھا، ان اوچھی حرکات کے ساتھ ساتھ سودے بازی کی کوشش بھی جاری رہی، جب یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا تو ظلم وجور کا باب کھل گیا۔

اس مقصد کے لیے قریش جمع ہوئے اور ۲۵؍ سرداران قریش نے باہمی مشورے اور غور وخوض کے بعد رسول اللہ ؐ اور آپ ؐ کے صحابہ ؓ کو ظلم وستم سے دوچار کرنے کی قرارداد منظور کی، پھر اس قرارداد کو روبہ عمل لانے کا عزم مصمم کیا گیا، بالآخر قریش نے ایک لمبے صبر کے بعد آپ ؐ کو تشدد سے دوچار کرنا شروع کر دیا، ابولہب بازاروں اور اجتماعات میں آپ ؐ کے پیچھے پیچھے لگا رہتا اور نہ صرف آپ ؐ کی تکذیب کرتا بلکہ آپ ؐ کو پتھر بھی مارتا جس سے آپ ؐ کی ایڑیاں خون آلود ہو جاتیں، آپ ؐ کو گھر کے اندر بھی اطمینان سے نہ رہنے دیا گیا، آپ ؐ کے گھر میں گندگی پھینکی گئی، آپ ؐ کے اوپر اونٹ کی اوجھڑی ڈالی گئی، آپ ؐ ہر براہ راست طعن کیا گیا، آپ ؐ کو خانہ کعبہ میں نماز کی ادائیگی سے روکا گیا اور اس حرم کے اندر آپ ؐ پر تشدد کیا گیا جہاں انسان تو کجا، حیوانوں اور جانوروں کو ایذا دینا بھی گناہ ہے، ہر چیز کو وہاں 'امان' حاصل ہوتی ہے۔

تشدد اور عقوبت کی اس خوف ناک کیفیت میں بھی رسول کریم ؐ نے حرم شریف میں قریش کے ایک بہت بڑے مجمع میں سورۂ نجم کی تلاوت فرمائی اور دعوت دین کی ذمہ داری کو ہر حال میں ادا کرنے کا درس پیش فرمایا، جب قریش نے جسمانی تعذیب وتشدد اور زبانی پروپیگنڈے اور حربوں کو آزمالیا اور دیکھا کہ یہ دعوت رکنے کے بجائے پھیل رہی ہے، تو انھوں نے اس بات کا عہد و پیمان کیا کہ بنی ہاشم کا مکمل مقاطعہ کر دیا جائے، پھر شعب ابی طالب میں بنی ہاشم کی محصوری کے یہ تین سال اس کیفیت مین گزرے کہ محصورین کو بنیادی انسانی ضروریات زندگی حاصل کرنے سے بھی روک دیا گیا، تین سال کے بعد قادر مطلق نے انھی قریش کے ذریعے یہ قرارداد بھی پاس کرائی کہ اس مقاطعے کی دستاویز کو چاک کر دیا جائے۔

اس روح فرسا عہد سے جب محصورین کو نجات ملی تو رسول کریم ؐ نے حسب معمول اپنی دعوت وتبلیغ کا کام شروع کر دیا، اس موقعے پر قریش کا وفد ایک بار پھر حضرت ابوطالب کے پاس آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام سے روکنے کا ان مطالبہ کیا، آپ ؐ نے قریش سے کہا کہ میں تم سے صرف ایک بات کہتا ہوں، مان لوگے تو عرب و عجم تمھاری ملکیت ہوں گے، قریش نے سوچا کہ صرف ایک بات اور وہ بھی اس قدر مفید! اسے کیسے مسترد کریں؟ آخر کار ابوجہل نے کہا: بتاؤ وہ بات کیا ہے، ایسی ایک بات کیا، دس باتیں بھی کرو تو ہم ماننے کو تیار ہوں، آپ ؐ نے فرمایا: لا الٰہ الا اللّٰہ کہو اور اللہ کے سوا جو کچھ پوجتے ہو اسے چھوڑ دو، اس پر قریش نے ایک بار پھر عہد کیا کہ ہم اپنے آباء واجداد کے دین پر قائم رہیں گے، یہاں تک کہ اللہ ہمارے اور اس شخص کے درمیان فیصلہ کر دے۔ سورۂ ص [۳۸: ۱-۷] میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

اگر کوئی شخص اس تشدد کی انتہا اور جنگ کی شدت کا تصور کرنا چاہے، جو قریش نے اس تن تنہا رسول ؐ کے خلاف برپا کر رکھی تھی تو اس کے لیے یہی جان لینا کافی ہے کہ وہ ابولہب، جو رسول اللہ ؐ کا بدترین دشمن تھا، ایک دن اس کا ضمیر بھی اس تشدد کو دیکھ کر یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ محمد ؐ کو پناہ دے گا اور آپ ؐ کے دشمنوں سے آپ ؐ کی حفاظت کرے گا، لیکن رسول اللہ ؐ سے اس کی پناہ واپس لوٹا دیتے ہیں اور خود تنہا کھڑے قربانی پیش کرتے جاتے ہیں۔

رسول اللہ ؐ نے مکہ سے باہر نکل کر طائف میں 'ثقیف' کی طرف رخ کیا اور انھیں اللہ کی طرف بلایا تو علاقے کے اشراف نے آپ ؐ کو گھیرے میں لے لیا، اور یہ تو آپ ؐ کے مکی حریفوں سے بھی زیادہ کمینے ثابت ہوئے، انھوں نے اپنے احمقوں اور اوباشوں کو اکسایا، حتی کہ مہمان کی عزت اور پناہ طلب کرنے والے کو پناہ دینے کی مقدس ترین عربی خصلت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا، انھوں نے ان اوباشوں کو آپ ؐ کے پیچھے لگا دیا اور وہ آپ ؐ کو پتھر مارنے لگے۔

رسول اللہ ؐ نے سفر طائف کا وہ منظر ہر داعی دین کے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے، جب آپ ایک باغ میں داخل ہو کر اس کی دیوار کی اوٹ لے کر ان احمقوں اور اوباشوں سے محفوظ ہونے کی کوشش کرتے ہیں، آپ ؐ کا دایاں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا ہوا ہے اور آپ ؐ دعا فرما رہے ہیں، اور بایاں ہاتھ چہرے پر رکھ کر پتھروں سے بچاؤ کے لیے ڈھال بنائے ہوئے ہیں۔

دعوت کے ساتھ رسول اللہ ؐ کی وابستگی

دعوت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ کیسا تعلق اور وابستگی تھی کہ جہاں بھی جاتے تن تنہا دعوت پیش کرتے تو شدائد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کرتے، ان حالات میں دنیاوی اسباب میں سے کوئی چیز ایسی نہیں تھی، جو آپ ؐ کی ہمت کو سہارا دیتی اور آپ ؐ کی ڈھارس بندھاتی لیکن آپ ؐ پھر بھی بھرپور عزم کے ساتھ ان حالات کا سامنا کرتے رہے، رسول اللہ ؐ جب طائف سے مکہ کی طرف واپس لوٹے تو مایوسی اور شکست خوردگی کا احساس نہیں تھا، ناکامی کا خیال نہیں تھا، بلکہ پر امیدی کی ایک گہری کیفیت تھی، جس نے آپ ؐ کو ڈھانپ رکھا تھا اور اللہ کی راہ میں قربان ہو جانے کا ایک بھرپور جذبہ تھا، جو آپ ؐ کے اندر موجزن تھا۔

آپ ؐ ایک ایک قبیلے کے پاس جا کر دعوت پیش کرتے، ایک روز قبیلہ کندہ کے پاس جاتے ہیں، ایک روز قبیلہ بنی حنیفہ کے پاس اور اگلے روز قبیلہ بنی عامر کے پاس تشریف لے جاتے ہیں، اس طرح یکے بعد دیگرے ہر قبیلے کے پاس پہنچتے ہیں اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں، قبائل کے پاس جب آپ ؐ تشریف لے جاتے تو ابولہب آپ ؐ کے پیچھے پیچھے یہ کہتا جاتا کہ اس کی بات نہ ماننا، یہ تمہیں گمراہی کی طرف بلا رہا ہے۔

نبوت کے گیارہویں سال موسم حج میں دعوت اسلامی کی رفتار کار میں ایک عجیب تبدیلی آئی، مکہ میں کھلی تبلیغ کی تو جا رہی تھی مگر وہ آسان اور خطرے سے خالی نہ تھی، اسی لیے رسول اللہ ؐ حجاج کو رات کی تاریکی میں ملتے اور انھیں اسلام پیش کرتے، ایک رات آپ ؐ حضرت ابوبکر ؓ کے ہمراہ باہر نکلے، بنو ذہل و بنو شیبان کو دعوت دی، مگر انھوں نے اسلام قبول نہ کیا، پھر یثرب کے اچھے سعادت مند روحوں سے ملاقات ہوگئی، یہ خزرج کے جوان تھے، آپ ؐ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا، بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانیہ حضور نبی کریم ؐ کی شبانہ مساعی کا ثمر تھیں، آپ ؐ نے رات کی تاریکی میں مکہ سے دور باہر جا کر رؤسائے یثرب کو اسلام پیش کیا تھا، جس کے نتیجے میں یہ بیعت عمل میں آئی، یہی واقعہ ہجرت مدینہ کی تمہید ثابت ہوا اور آپ ؐ بالآخر مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے۔

انسانیت کی نجات کا بے مثال جذبہ

حضرت جابر ؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میری اور تمہاری مثال اس آگ جلانے والی جیسی ہے جو آگ جلائے تو پتنگے اور حشرات آ کر اس میں گرنے لگیں اور وہ آدمی ان کو آگ سے بچانے میں کوشاں ہو، میں (بھی) تمہیں کپڑوں (دامن) سے پکڑ پکڑ کر آگ سے دور کھینچتا ہوں لیکن تم دامن چھڑا چھڑا کر میرے ہاتھ سے نکلے جاتے ہو)۔[احمد، مسلم]

انسانیت کو دائرۂ ایمان میں لے آنے اور جہنم سے بچانے کے لیے نبی کریم ؐ کی خواہش اس حد تک غیر معمولی تھی کہ اس فکرمندی سے آپ ؐ کی صحت پر منفی اثرات پڑنے کا خدشہ ظاہر ہو گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:'' فلعلك باخع نفسك على آثارهم ان لم يؤمنوا بهذا الحديث اسفا''[الکھف ۱۸:۶] (اچھا، تو اے نبی ؐ! شاید تم ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان کھو دینے والے ہو، اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے)۔ اس کے بعد آپ ؐ کو ان ہدایات سے نوازا گیا جن میں یہ وضاحت تھی کہ نبی اور رسول کی ذمہ داری دعوت حق کا ابلاغ (انذار و تبشیر) ہے، اس دعوت کو کون مانتا اور کون نہیں مانتا اور کیوں نہیں مانتا؟ نبی اور رسول سے اس بات کی جواب دہی نہیں ہوگی اور نہ نبی اور رسول کے دائرہ اختیار میں ہے کہ وہ جس کے ایمان لے آنے کی خواہش اور آرزو کرے وہ ایمان لے آئے اور ہدایت یافتہ ہو جائے، نبی کی ذمہ داری صرف اور صرف، دعوت حق کی تبلیغ، تذکیر اور انذار و تبشیر کی ہے، چنانچہ نبی کریم ؐ کی اس فکرمندی کے پیش نظر آپ ؐ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: "انك لا تهدى من أحببت ولكن الله يهدى من يشاء"[القصص ۲۸:۵۶] (اے نبی! تم جسے چاہو اسے ہدایت نہیں دے سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے)۔

"وما اكثر الناس ولو حرصت بمؤمنين"[یوسف ۱۲:۱۰۳] (تم خواہ کتنا ہی چاہو ان میں سے اکثر لوگ مان کر دینے والے نہیں ہیں)۔

بلکہ صاف صاف فرما دیا کہ:

"و ما جعلنك عليهم حفيظاً، وما أنت عليهم بوكيل" [الانعام ۶:۱۰۷] (تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے، اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو)۔

دوسری جگہ فرمایا: "فانما عليه البلغ و علينا الحساب" [الرعد ۱۳:۴۰] (بہر حال تمہارا کام صرف پیغام دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے)۔ "فذكر انما أنت مذكر، لست عليهم بمصيطر" [الغاشیۃ ۸۸:۲۱-۲۲] (اچھا تو (اے نبی ؐ) نصیحت

کیے جاؤ! تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو)۔ ” انا انزلنا عليك الكتب للناس بالحق ،فمن اهتدى فلنفسه ، ومن ضلّ فانما يضلّ عليها ، وما أنت عليهم بوكيل“ [الزمر ۳۹:۴۱] (اے نبیؐ) ہم نے سب انسانوں کے لیے یہ کتاب برحق تم پر نازل کردی ہے، اب جو سیدھا راستہ اختیار کرے گا اپنے لیے کرے گا اور جو بھٹکے گا اس کے بھٹکنے کا وبال اسی پر ہوگا، تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو)۔

اس مضمون کی متعدد آیات اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ نبی کریمؐ ابلاغ دعوت کے معاملے میں بے حد فکرمند رہتے تھے، آپؐ کی شب و روز کی مصروفیات میں ابلاغ حق کی ذمہ داری کو کمال درجے میں ادا کرنے کی جدوجہد سامنے آتی ہے، مکی زندگی میں خفیہ اور علانیہ دعوت الی اللہ کی انجام دہی، قومی اور قبائلی سطح کی خصوصی تقریبات میں رہنماؤں سرداروں اور دانشوروں سے خطاب، مکہ کے اندر اور حدود مکہ سے باہر آپؐ نے اپنے مشن کی تکمیل اور حکم الٰہی کی تعمیل کے لیے حیرت انگیز جدوجہد فرمائی۔

انسانیت کی سلامتی پر نظر

مکی عہد میں مسلمانوں اور خود رسول کریمؐ کو سخت عقوبتوں اور ایذاؤں سے مسلسل دوچار رکھا گیا لیکن دعوت دین کا کام رسول اللہؐ نے برابر جاری رکھا، آخری تنبیہ کے طور پر جب قریش کے وفد نے آپؐ کے چچا ابوطالب سے دوٹوک بات کردی تو آپؐ نے جواب میں جو الفاظ ادا فرمائے، وہ اس ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے آپؐ کی عزیمت و استقامت کی بے نظیر دلیل ہیں، طائف کا سفر آپؐ کی ظاہری بے سروسامانی مگر حق کی دعوت کو قریہ قریہ پہنچانے کے لیے آپؐ کی تڑپ کی نشان دہی کرتا ہے، آپؐ کے سفر طائف کی روداد دین کے ہر داعی اور تحریک کے ہر کارکن کے لیے ایک عظیم درس ہے، آپؐ کی جدوجہد کا مکی عہد جب اختتام کو پہنچا تو یہ محض ۱۳/برس کی مدت کا خاتمہ نہیں تھا بلکہ یہ ظلم و جور اور تعذیب و تشدد کی المناک تاریخ کا ایک موڑ تھا، اس تاریخ کی المناکی اس قدر شدید تھی کہ حاملین دعوت کو داعی اعظمؐ نے اذن ہجرت دے دیا۔

ہجرت کے بعد مدنی دور نبوت بھی معمول کی انسانی زندگی سے ناآشنا ہی رہا، قریش کی دیرینہ رقابت، نفرت اور عداوت نے حاملین ایمان کا تعاقب یہاں بھی نہ چھوڑا، اور نبی کریمؐ اور آپؐ کے رفقا کو کش مکش اور تصادم میں مسلسل الجھائے رکھا، براہ راست یا بالواسطہ اس تصادم کی تمام تر تاریخ میں آپؐ نے اپنی توجہ اور جدوجہد کا پورا ارتکاز دعوت پر رکھا، حتی الامکان تصادم سے گریز کیا، حالت جنگ میں بھی دشمن کے اظہار ایمان کو قانونی طور پر قابل قبول قرار دیا، آپؐ نے دشمن کے ساتھ ایسے معاہدے بھی کیے جو بظاہر اہل ایمان کے لیے شکست دکھائی دیتے تھے، دشمن کے ساتھ مکالمے، مذاکرات اور معاہدات میں ہمیشہ نرم گوشہ رہے اور یہ کسی کمزوری کی بنا پر نہیں بلکہ انسانیت کو فتنہ و فساد سے بچانے اور اللہ کے دین کی طرف لانے کی غرض سے کیا، اپنے اصحاب و رفقاء اور اہل ایمان و اسلام کی تعلیم و تربیت میں بھی ہمیشہ سختی اور شدت سے گریز کیا اور نرمی، ملائمت اور امید و رجا کے پہلو کو پیش نظر رکھا، تعلیم و تبلیغ اور انذار و تبشیر سے ہی کام لیا اور دل و دماغ کی طاقتوں کی بیداری کے ذریعے فرد اور معاشرے کو بدلنے کی سعی فرمائی، آن واحد میں تبدیلی لے آنے کے بجائے رفتہ رفتہ اور تدریج کے ساتھ اصلاح احوال کا کارنامہ انجام دیا، مشکل مشکل اور سخت سے سخت حالات اور ماحول میں بھی ناامیدی اور مایوسی کو قریب نہ آنے دیا، فتح مکہ کے موقع پر ایسے تمام دیرینہ دشمنان اسلام کو بھی معاف فرمادیا جن کی گردن اڑانے کا حکم جاری فرمایا جا چکا تھا اور یہ سب ان لوگوں کے اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے ہوا، مملکتوں کے سربراہان کو مکتوبات اور نمائندوں کے ذریعے اسلام کی دعوت پیش کی، کسی قبیلے، قوم اور ملک کے خلاف جنگی اقدام کرنے سے پہلے اس کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے کی حجت تمام فرمائی، مخاطب دشمن نے اسلام قبول کرلیا تو اس خندہ روئی سے گلے لگایا اور اگر انکار کیا تو تباہ و برباد، نیست و نابود اور تہس نہس کر ڈالنے کی ذہنیت او رحکمت عملی کے تحت اس سے جنگ نہیں کی، بلکہ عین حالت جنگ میں بھی دشمن کے قبول اسلام کا داعیہ دل میں موجود رہا اور ہر ممکن طریقے سے انسانیت کو بچانے کی خواہش دامن گیر رہی۔

ابلاغ دعوت کی مسلح و غیر مسلح کش مکش میں ہمیشہ انسانیت کی سلامتی اور اسے اللہ کی بندگی میں لے آنے کا داعیہ غالب رہا، دعوت دین پیش کرنے کے لیے ہر خفیہ و علانیہ سرگرمی کو حسب موقع جاری رکھا، طائف کا سفر سرزمین مکہ کے بنجر ہونے کی طرف اشارہ تھا مگر اہل طائف نے بھی مکہ سے اپنی ذہنی قربت کا ثبوت دیا اور جس بدترین سلوک سے آپؐ سفر طائف میں دوچار ہوئے، اس پر رب رحیم و کریم نے بھی غضب ناکی کا اظہار فرمایا، پہاڑوں کے فرشتے نے اسی موقعے پر عرض کیا تھا کہ آپؐ چاہیں تو میں انہیں دو پہاڑوں کے درمیان کچل دوں، اس پر نبیؐ نے فرمایا: نہیں، مجھے امید ہے کہ اللہ عزوجل ان کی پشت سے ایسی نسل پیدا کرے گا جو صرف ایک اللہ کی عبادت کرے گی اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائے گی [بخاری]۔ اس موقعے پر رسول اللہؐ نے جو دعا فرمائی وہ دعائے مستضعفین (کمزوروں کی دعا) کے نام سے مشہور ہے، اس دعا کا ایک ایک لفظ انسانی ناتوانی کا اظہار ہے مگر رب سے امید اور اس سے

عافیت طلبی کا بے نظیر شاہکار ہے، اس دعا کے اندر مایوسی وناامیدی اور منکرین دعوت کی ہلاکت و بربادی کی دعا کا قطعاً اظہار نہیں ہے۔

’اٹھو اور خبر دار کرو‘ کا حق ادا کر دیا

دعوت نبوی ﷺ کا آغاز دوسری وحی کے ان الفاظ سے ہوا تھا: "یا أیھا المدثر، قم فأنذر" [المدثر ۷۴: ۱،۲] (اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور خبر دار کرو)، دعوت الی اللہ کی ذمہ داری کے لیے اٹھنے کا یہ حکم ملا تو پھر رسول اللہ میدان عمل میں تن تنہا کھڑے ہو گئے، انسانیت پر ڈالا جانے والا بوجھ زمین وآسمان اور دشت وجبل نے اٹھانے سے انکار کر دیا تھا اور خوف ودہشت کے مارے سہم گئے تھے، اس بوجھ کو انسان نے اٹھالیا اور وہ اس کے انجام سے لاعلم تھا لیکن انسانیت کے محسن انبیائے کرام نے اس بوجھ کو اپنے کندھوں پر اٹھانے کی ذمہ داری کا حق ادا کر کے انسانیت کے اس شرف واعزاز کو نقش دوام بنادیا۔

ہادی عالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو اس ذمہ دری کے حق کی ادائیگی کا لازوال اور بے نظیر کارنامہ انجام دیا، آپ ؐ نے قم فأنذر (اٹھو اور خبر دار کرو) کا حکم سنایا اور پھر مسلسل اور پیہم معرکہ آرائی میں ۲۰/سے زائد برس گزار دیے اور اس دوران آپ ﷺ کو کوئی ایک معاملہ دوسرے معاملے سے غافل نہ کر سکا۔

سیرت رسول ﷺ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر دعوت الی اللہ کا حق ادا کرنے کی سعی فرمائی اور اپنے آخری اور عالم گیر خطاب حجۃ الوداع میں حاضرین سے یہ شہادت لی کہ: ”تم سے میرے متعلق پوچھا جانے والا ہے، تو تم کیا کہو گے؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ ؐ نے تبلیغ کر دی، پیغام پہنچا دیا اور خیر خواہی کا حق ادا فرما دیا، یہ سن کر آپ ؐ نے شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور لوگوں کی طرف جھکاتے ہوئے تین بار فرمایا: ”اے اللہ گواہ رہ، اے اللہ گواہ رہ، اے اللہ گواہ رہ“۔ [ابن ہشام]

آج کے داعی کی ضرورت

دعوت الی اللہ کا حق ادا کرنے کے لیے ہر دور کے داعی کو اسی بصیرت، ہمت، صبر، استقامت، اور عزم وعزیمت کی ضرورت رہی ہے اور عہد حاضر کے کارکنان دعوت کو بھی آج اسی چیز کی ضرورت ہے، جس کا مظاہرہ سیرت رسول ؐ کے ایک ایک ورق میں ملتا ہے، امت مسلمہ ’خیر امت‘ ہونے کی بنا پر اس دعوت کے ابلاغ کی پابند ہے، دعوت اپنے اثرات اور نتائج سے مشروط نہیں ہوتی بلکہ سیرت کی روشنی سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ داعی اور کارکن اثرات اور نتائج کو اللہ کا اختیار سمجھ کر اپنی ذمہ داری ادا کیے جاتا ہے، وہ صرف اس بات کا پابند ہے کہ دعوت کہاں تک پہنچائی اور اس کا حق کس حد تک ادا کیا، اس سے آگے اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔

آج دین کی دعوت کو اسی سوز جگر کے ساتھ انسانیت تک پہنچانے کی ضرورت ہے جو دعوت کے نبوی ؐ طریق کار میں نظر آتا ہے، ایک داعی کی جدوجہد کا اصل مقصد اللہ کے دین کو انسانوں تک پہنچانا ہے، دعوتی حلقوں کو اس بات کا پوری سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ دین کی دعوت کا ابلاغ کس حد تک ہو سکا، اصل، صحیح اور خالص دین سے معاشرے کی بہت بڑی تعداد ناواقف ہے، آباء واجداد سے چلی آنے والی رسوم وروایات آج بھی قوم کی اکثریت کا دین ہے، کہیں جہالت اس کا سبب ہے اور کہیں دین کا ناقص اور غیر صحیح تصور وفہم اس کا باعث ہے، معاشرے کو بڑی تبدیلی کے لیے تیار کرنے کی ضرورت ہے، نبی اکرم ؐ کا دین تعبیرات وتشریحات کے انباروں تلے گم ہے، محمد رسول اللہ ؐ کی شریعت کا مصدر اول قرآن مجید ابھی تک مجموعی طور پر مسلم معاشرے کی سنجیدہ توجہ کا منتظر ہے، دعوتی حلقوں میں قرآن مجید کے براہ راست فہم کو اپنی مساوی کا محور بنانے کی ضرورت ہے، قرآن مجید کا راست فہم داعی کے لیے راستے کی بے شمار مشکلات کا حل پیش کرتا ہے، اس سے بڑھ کر حکمت سے لبریز کوئی کتاب نہیں اور راستے کا اس سے بہتر کوئی رہنما نہیں، یہ کتاب داعی اعظم حضرت محمد ؐ کو ۲۳/ برس تک مسلسل دین کا پیغام بھی بتاتی رہی اور ابلاغ دین کا طریق کار بھی واضح کرتی رہی، سیرت النبی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہی دین ہے اور یہی طریق دین، یہی دعوت ہے اور یہی اسلوب دعوت! اس سے بے نیاز ہو کر کوئی شخص داعی نہیں بن سکتا اور اس سے ہٹ کر کوئی راستہ منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔

بہت کم لوگوں نے براہ راست سیرت النبی ؐ کا مطالعہ اس طرز پر کیا ہوگا کہ نبی کریم ؐ کو دعوت دین کی جدوجہد کے دوران کیسے مراحل پیش آئے اور آپ ؐ کا رد عمل اور حکمت عملی ان مراحل میں کیا رہی، صیام رمضان مناسک حج اور مسائل عیدین کی طرح قرآن وسیرت ایسا موضوع نہیں ہے جس کی یاد سال کے بعد تازہ ہوتی ہو، بلکہ یہ مسلمان کی زندگی کا دائمی نصاب اور مستقل موضوع درس ہے، اسے سالانہ بنیادوں پر بڑے بڑے پروگراموں، تقریبات اور جلسے جلوس کی صورت میں منعقد کر کے نہ اس کا حق ادا کیا جا سکتا ہے اور نہ یہ طریقۂ یاد رسول اللہ کے شایان شان ہے، ہر دینی کارکن کو خود سے یہ سوال کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا اس نے زندگی میں ایک بار مکمل قرآن حکیم کا مطالعہ شعوری طور پر اس سے ہدایت پانے کی غرض سے کیا ہے؟ کیا اس نے نبی کریم ؐ کے اسوہ حسنہ کو اپنی زندگی کا رہنما بنانے کے لیے سیرت النبی ؐ کا مطالعہ کیا ہے؟

☆☆☆☆☆

تعارف و تبصرہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی مثالی خلافت

شاہ آیت اللہ قادری کی کتاب ''خلافت وملوکیت اور حضرت عمر بن عبدالعزیز'' کا مختصر تعارف

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

کتابیں تو ہمیشہ شائع ہوتی رہتی ہیں مگر ایک انگریز مفکر کے بقول بعض کتابیں صرف دیکھنے کے لیے ہوتی ہیں، بعض چکھنے کے لیے ہوتی ہیں اور بعض پورے طور پر ہضم کرنے اور اپنے فکر کی غذا بنانے کے لیے اور بار بار غور کرنے کے لیے ہوتی ہیں، پیش نظر کتاب بھی ایسی ہی ایک اہم کتاب ہے جسے فکر کی غذا بنانے کی ضرورت ہے اور جس کی ایک مدت تک بازگشت علمی دنیا میں سنی جائے گی اور ایک مدت تک گنبد مینا میں اس کی گونج موجود رہے گی، یہ وہ کتاب ہے جسے ہر تعلیم یافتہ شخص کو پڑھنا چاہیے، امیر ہو یا مامور، مالک ہو یا مزدور، سلطان ہو یا جمہور، خاقان ہو یا فغفور، ہر شخص کے مطالعہ میں یہ کتاب لازمی طور پر آنی چاہیے، کیونکہ کتاب کا موضوع بہت اہم ہے اور ہمیشہ اہم رہا ہے، یعنی اسلام کا نظام سیاست وحکومت اصل میں کیا ہے اور اس کی نمائندہ شخصیت تاریخ میں کون کون سی ہے، یہ بہت اہم موضوع سخن ہے، یہ متاع علم وفن ہے، یہ حاصل ہزار مطالعہ ہے، یہ پوری تاریخ کا سب سے اہم حوالہ ہے، ہر دور میں جب صبح کو آفتاب طلوع ہوتا ہے، جب شام کو شب ماہتاب جلوہ فشاں ہوتی ہے، جب کسی وقت کچھ اہل علم ودانش کچھ ارباب عقل وبینش جمع ہوتے ہیں، اس اہم موضوع پر بات ہوتی ہے، سیرت اور تاریخ کے حوالے دیے جاتے ہیں، اسلام کا نظام خلافت وحکومت ایک نخل تمنا اور ایک شجر آرزو بن کر ابھرتا ہے اور مسلمان ملکوں کی اس نظام خلافت سے محرومی اہل نظر کے لیے دیدۂ بیتاب اور چشم پرآب کی شکل اختیار کر لیتی ہے، ایک بھی مسلم ملک کرۂ ارضی پر نہیں ہے جس نے خلافت راشدہ کے نظام حکومت کو اپنا آئیڈیل بنایا ہو، سب سے زیادہ غم کی بات نہیں ہے کہ اب زیادہ تر لوگوں کے چہرہ پر گرد ملال نہیں ہے۔

عالم اسلام میں بے شمار مسلمانوں کی حکومتیں موجود ہیں لیکن ایک بھی وہ مثالی حکومت نہیں جسے واقعی اسلامی حکومت کہا جائے، یہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے اس لائق ہے کہ عربی زبان میں اور دنیا کی دیگر زبانوں میں اس کے ترجمے ہوں، ہر مسلمان کے گھر میں موجود ہو اور ہر شخص کے دل میں ایک نخل تمنا موجود ہو، ابھی تو بے ذوقی کا حال یہ ہے کہ ہندوستان کا اردوداں طبقہ ہی اسے پڑھ لے تو بڑی بات ہوگی، اسلام کے سیاسی اجتماعی نظام کی نقل مطابق اصل نہ سہی لیکن اس کی شبیہ موجود ہے، اس کا سایہ موجود ہے، اس کے اکابر اور اصاغر اس کا مطالعہ کر لیں تو بھی بڑی بات ہوگی، اسلام کے اجتماعی نظام میں، نئے حالات میں کن اجتہادات کی گنجائش ہے اس سے لوگ بے خبر ہیں، بہت سے نئے مسائل پر اہل علم کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔

راقم سطور کی نظر میں ان موضوعات پر تفصیلی گفتگو اور بحث علامہ یوسف القرضاوی کی اسلامی سیاست پر ایک کتاب "فقہ الدولة فی الاسلام" میں اور ان کی دوسری کتاب "فقہ الجھاد" میں آئی ہے جو دو ضخیم جلدوں میں ہے، یہ اہم ترین کتابیں عربی زبان میں ہیں، لیکن ہر شخص کے لیے ان سے استفادہ آسان نہیں، ''کشتی در چین وملاح در فرنگ'' والا معاملہ ہے، اردو میں ان مسائل پر گفتگو ایک کتاب میں ملے گی جس کا نام ''اسلام کا نظام سیاست وحکومت'' ہے جو دہلی سے حال میں شائع ہوئی ہے لیکن اب کون کتاب پڑھتا ہے، ہر ایک کے ہاتھ میں موبائل ہے جو علم تک پہونچنے میں حائل ہے، اب وہ زمانہ باقی نہیں رہا جب لوگ کتاب لے کر کسی صحن چمن میں چلے جاتے تھے اور کتاب پڑھتے تھے اور زبان حال سے حافظ شیرازی کا مصرعہ دہراتے تھے: ''فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے''۔

پیش نظر کتاب کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا مباحث کی اہمیت کا فاضل مصنف کو پورا احساس ہے، اس لیے یہ کتاب صرف حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سوانح نہیں ہے بلکہ اس میں اسلام کے نظام سیاست کی روح بھی آگئی ہے، مصنف کتاب رقم طراز ہیں:

''اس کتاب کی تالیف کا اصل مقصد حضرت عمر بن عبدالعزیز کی سیرت وشخصیت اور کارناموں کو بیان کرنا تھا لیکن آپ جیسے جلیل القدر خلیفہ راشد سادس کی ذات پاک کے بیان سے قبل خلافت کی حقیقت، اسلامی حکومت کے اصول و قواعد، اسلام کے سیاسی نظام اور اسلامی سیاست کے بنیادی مسائل کو بھی جمع کرنا مناسب معلوم ہوا تاکہ اس کے ذکر سے یہ بھی معلوم ہوجائے کہ اسلامی سیاست کیا ہے اسلامی قانون میں ترمیم و تنسیخ ہوسکتی ہے یا نہیں، خلافت کے کیا معنی ہیں اس منصب کا مستحق کون ہے، اس میں کن صفات اور خصوصیات کا ہونا لازمی ہے، شریعت کی طرف سے اس کو کیا اختیارات حاصل ہیں، خلیفہ اور

بادشاہ میں کیا فرق ہے؟ چنانچہ اسی کی بنیاد پر پیش نظر کتاب میں ان امور کو بھی شامل کیا گیا ہے"۔

ان مباحث سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ کتاب کتنی قیمتی ہے، یہ کتاب قیمتی مباحث کا خزانہ ہے:"کتاب ینوب عن کتائب" کی مصداق ہے، خود مصنف کا قلم تیغ اصیل بھی ہے صور اسرافیل بھی ہے۔

یہ کتاب تاریخ اور علم شریعت کی جامع کتاب ہے، اس میں سیاست وخلافت کے موضوع پر ایسی علمی بحثیں بھی ہیں جو عام کتابوں میں نہیں ملتی ہیں، ہندوستان میں نصف صدی میں اسلامی سیاست پر بہت سی کتابیں تصنیف کی گئی ہیں لیکن بارہ خلفاء والی حدیث پر گفتگو ان میں موجود نہیں ہے، نصف صدی پہلے دار المصنفین سے مولانا اسحاق سندیلوی ندویؒ کی کتاب اسلام کے سیاسی نظام کے موضوع پر شائع ہوئی تھی، اس کی بعد مولانا حامد الانصاری غازی کی کتاب اسلام کا نظام حکومت کے نام سے ندوۃ المصنفین سے شائع ہوی تھی، ان دونوں کتابوں میں یہ بحث نہیں ہے، بعد میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان دونوں کتابوں میں بھی بارہ خلفاء کی بحث موجود نہیں ہے جب کہ بارہ خلفاء کی بحث صرف شیعی مکتب فکر کی بحث نہیں ہے بلکہ اہل سنت کے علماء کے بھی اس بارہ خاص میں نظریات ہیں، زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اسلام کے سیاسی اجتماعی نظام میں کن اجتہادات کی ضرورت ہے، اس کے لیے مصنف کتاب جناب شاہ آیت اللہ قادری سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ نے عالمانہ بحثیں کی ہیں اور یہ کتاب کا امتیاز ہے، ان کی ژرف نگاہی اور تحقیقی بصیرت ہر جگہ نمایاں ہے۔

اس کتاب کا مختصر تعارف مختصر لفظوں میں اگر بیان کیا جاسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خلافت راشدہ اور مابعد خلافت راشدہ کے بارے میں اہل سنت والجماعت کا صحیح اور متوازن نقطہ نظر جاننا چاہتا ہے تو اس کو اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے، اردو زبان میں اگر کوئی شخص عہد نبوت کے بعد کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو اسے مشورہ دیا جاسکتا ہے کہ وہ پہلے مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ کی "صدیق اکبرؓ" پھر مولانا شبلی نعمانیؒ کی "الفاروقؓ" پھر مولانا اکبرآبادیؒ کی "عثمان ذوالنورینؓ" پھر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی "المرتضیٰ" اور آخر میں شاہ محمد آیت اللہ قادری (سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ) کی کتاب "خلافت وملوکیت اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ" کا مطالعہ ضرور کرے، حضرت عمر بن عبد العزیز کی شخصیت آسمان تاریخ میں بدر کامل کے مانند ہے اور ہر دور میں اہل قلم واہل علم کے لیے ان کے حالات شوق انگیز، ولولہ خیز اور امید افروز رہے ہیں، ہر عہد میں علماء نے ان کو اپنا آئیڈیل قرار دیا، ابن جوزیؒ نے ان پر دو کتابیں لکھیں، ایک "سیرت عمر بن عبد العزیز" اور دوسری کتاب "مناقب عمر بن عبد العزیز"، عہد حاضر میں مولانا عبد السلام ندویؒ نے "سیرت عمر بن عبد العزیز" لکھی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے "تاریخ دعوت عزیمت" میں انہیں نمایاں جگہ دی، اسلام کی اجتماعی زندگی اور سیاسی زندگی کی گاڑی خلافت راشدہ کے بعد پٹری سے اتر گئی تھی حضرت عمر بن عبد العزیز نے دوبارہ اسے پٹری پر ڈال دیا۔

اسلام انفرادی زندگی کا نظام بھی ہے اور اجتماعی زندگی کا نظام بھی ہے، انفرادی زندگی کے نظام کو برتنے والے تقوی وطہارت کی زندگی اختیار کرنے والے، ذکر واذکار اور عبادت وتلاوت میں مشغول رہنے والے کبھی کم نہیں رہے، لیکن اجتماعی زندگی کے نظام کو درست کرنے میں بہت سی دشواریاں آتی ہیں، سنگ گراں حائل ہوجاتے ہیں، اور اسلام کی اجتماعی زندگی کی آبجو سنگ رہ سے گاہ بگاہ ٹکراتی ہوئی آگے بڑھتی ہے، کبھی وہ آب رواں اور کبھی طوفان بن جاتی ہے، ہفت اقلیم پر چھاجاتی ہے اور کبھی ہفت اقلیم کی فضا اور آب وہوا سے خود متاثر ہوتی ہے، اس کا رنگ وآہنگ اور مزاج بدل جاتا ہے اور حکومتیں اس کا راستہ روک دیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظام خلافت راشدہ کے بعد اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہا، اس کے بعد کی تاریخ یہ ہے کہ کچھ لوگ اجتماعی زندگی کی چول کو دوبارہ درست کرنے اور گاڑی کو پٹری پر لانے کی کوشش کرتے ہیں، اسلام کے اجتماعی اور شورائی نظام کی بازیابی کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، لیکن طاقت کی کمی اور وسائل کی قلت کی وجہ سے ناکام ہوجاتے ہیں، کچھ لوگ انقلابی کوششوں کا ساتھ دیتے ہیں اور کچھ لوگ دل سے تو ساتھ دیتے ہیں لیکن اپنے وسائل کو لے کر اٹھنے اور ساتھ دینے کی ہمت نہیں کرتے ہیں پھر وہ اور اپنے آپ کو تزکیہ وتربیت اور دینی علوم کی تدریس کے کاموں میں مشغول کرلیتے ہیں اور اپنے ضمیر کو اس کام پر مطمئن کرلیتے ہیں، تاریخ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

خانقاہ مجیبیہ نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کی بہت اہم خانقاہ ہے، دینی علمی دونوں اعتبار سے اس کا وزن ہے، اس کے پاس شاندار لائبریری ہے جس میں نادر مخطوطات ہیں "المجیب" جیسا علمی رسالہ جہاں سے شائع ہوتا ہے، ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب شوق کے ہاتھوں لی جائے گی اور سرمہ نظر بنائی جائے گی اور ہر تعلیم یافتہ شخص کے ہاتھ تک پہونچے گی اور مستقبل میں انقلاب کا ہراول دستہ ثابت ہوگی۔

☆☆☆☆☆

نبی رحمت

سیرت نبویؐ میں رحم وکرم کے تابندہ نقوش

مولانا محمد طارق نعمان

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو ایک بڑی دولت اور نعمت سے نوازا ہے جو پورے دین کو جامع اور اس کی تبلیغ کا بہترین ذریعہ ہے، وہ نعمت اور دولت اخلاق ہے، ہمارے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے اعلیٰ معیار پر تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رازدار زندگی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں، آپؐ کے اخلاق کا نمونہ قرآن کریم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہر قول وفعل سے ثابت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کے لیے تشریف لائے، چنانچہ ارشاد ہے: ”انما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق“ یعنی میں اخلاق حسنہ کی تکمیل کے واسطے بھیجا گیا ہوں۔ پس جس نے جس قدر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے فائدہ اٹھا کر اپنے اخلاق کو بہتر بنایا اسی قدر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں اس کو بلند مرتبہ ملا، صحیح بخاری کتاب الادب میں ہے: ان خياركم أحسنكم أخلاقاً یعنی تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی اخلاقِ حسنہ سے عبارت تھی، قرآن کریم نے خود گواہی دی: انك لعلى خلق عظيم یعنی بلاشبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق کے بڑے مرتبہ پر فائز ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو بھی ہمیشہ اچھے اخلاق کی تلقین کرتے، آپؐ کے اس اندازِ تربیت کے بارے میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ کو دیکھا کہ آپؐ لوگوں کو عمدہ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔ [صحیح مسلم]

ترمذی شریف میں ایک جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ: تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اخلاق کے اعتبار سے سب سے اچھا ہو، چنانچہ عظمت اخلاق آخری نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ہے، سارے انبیاء اخلاق کی تعلیم دینے کے لیے دنیا میں آئے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس ہدایت کے آخری رسول ہیں، یا یوں سمجھئے کہ قرآنی نظریہ اخلاق ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نمونہ اخلاق ہیں، جب نظریہ عمل میں ڈھلتا ہے تو کمی بیشی عموماً ہوجاتی ہے، مگر اخلاق کا نظریہ جتنا معقول اور مستحکم ہے اتنا ہی مستحکم اخلاق کا نمونہ بھی ہے، اسی لیے دنیا کے بیشتر مفکرین اور معلمین کی نظر میں اخلاق کا درس خوشنما نظر آتا ہے، مگر جب ان کے قریب جایئے تو فکر وعمل کا تضاد اور گفتار وکردار کا اختلاف سامنے آتا ہے، لیکن رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ یہ ہے کہ ان کی گفتار جتنی پاکیزہ ہے، کردار اتنا ہی پاکیزہ نظر آتا ہے، تعلیم جتنی روشن نظر آتی ہے، سیرت اتنی صیقل دکھائی دیتی ہے، کہیں پر کوئی جھول یا کسی قسم کا کھوٹ نہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ واقعی اس اعزاز کے مستحق تھے، کیوں کہ وہ کون سا خلق حسن ہے جو آپ کی ذات گرامی میں نہیں تھا، حیا جس کو تمام اخلاق میں سب سے افضل اور عظیم ترین خلق قرار دیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی میں اس کے دخل کا یہ حال تھا کہ سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک باکرہ اور بے نکاح لڑکی اپنے پردے میں جس قدر حیا کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حیادار تھے:

خوشبو ہے دو عالم میں تری اے گلِ چیدہ
کس منہ سے بیاں ہوں ترے اوصافِ حمیدہ

اخلاق کی ایک اعلیٰ صفت غصہ کو دبانا اور ضبط کرنا ہے جو برسوں کی ریاضت کے بعد کسی کو حاصل ہوتی ہے، اس کے فضائل بیان کردینا تو آسان ہے مگر اس پر عمل کرنا بڑا مشکل ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر یہ اعلیٰ صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اگر سیرت کا مطالعہ غور سے کیا جائے تو اس کی مثال قدم قدم پر ملیں گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا جب مکہ سے ہجرت کرکے (اونٹ پر سوار ہوکر) مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہورہی تھیں، تو راستہ میں ہبار بن اسود نامی ایک شخص نے انہیں اتنی تیزی سی نیزہ مارا کہ وہ اونٹ سے گر پڑیں، حمل ساقط ہوگیا، اس صدمہ سے تاب نہ لاسکیں اور اللہ کو پیاری ہوگئیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس حادثہ کی خبر ہوئی تو آپؐ بہت غضب ناک ہوئے اور آپؐ کو اس بات سے بہت صدمہ ہوا، جب بھی اس حادثہ کی یاد تازہ ہوجاتی تو آبدیدہ ہوجاتے

لیکن جب ہبار بن اسود اسلام لے آئے اور معافی کی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں معاف کردیا۔

اسی طرح وحشی بن حرب جن کی ذات سے اسلامی تاریخ کے تلخ ترین حادثہ کی یادوابستہ ہے، کہ جنھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ومشفق چچا کو قتل کیا تھا لیکن جب انھوں نے اسلام لاکر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا اسلام تسلیم فرمالیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قتل کی کیفیت دریافت فرمائی جب انھوں نے واقعہ بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر گریہ طاری ہوگیا اور فرمایا وحشی! تمہارا قصور معاف ہے لیکن تم میرے سامنے نہ آیا کرو، تمہیں دیکھ کر پیارے شہید چچا کی یادتازہ ہوجاتی ہے:

جس طرح لب ملتے ہیں نام محمدؐ کے سبب
کاش کہ ہم سب مل جائیں نام محمدؐ کے سبب

اخلاق ایمانی وانسانی کی ایک اعلیٰ صفت وفا بھی ہے جس کے اندر وفا نہ ہو وہ یقیناً انسانیت اور ایمان کے کمال سے محروم ہے، قرآن میں بدعہدی کو یہود جیسی مردود قوم کی صفت بتایا گیا ہے اور ایفائے عہد کو مومنوں، متقیوں اور اللہ کے نبیوں کی صفت قرار دیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ میں ایک اخلاق یہ بھی ہے کہ آپ ہمیشہ وفائی کرتے تھے، بے وفائی اور عہد شکنی نہیں کرتے تھے، حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ مجھے قریش نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کسی کام سے بھیجا (یہ اس وقت کی بات ہے جب میں اسلام سے محروم تھا)، جب میں نے آپؐ کی زیارت کی تو فوراً میرے دل میں اسلام کی محبت بیٹھ گئی، چنانچہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! خدا کی قسم اب میں یہاں سے واپس نہیں جاؤں گا مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ تو میں وعدہ خلافی کرتا ہوں اور نہ عہد شکنی کرتا ہوں اور نہ ہی غلاموں کو روکتا ہوں، فی الوقت تم واپس چلے جاؤ البتہ اگر تمہارے دل میں یہی جذبہ یہی ارمان یہی تمنا یہی خواہش رہی تو پھر واپس چلے آنا چنانچہ میں اس وقت تو چلا گیا لیکن بعد میں خدمت اقدس میں حاضر ہوکر اسلام قبول کرلیا۔

ہوں لاکھوں سلام اس آقا پر بت لاکھوں جس نے توڑ دیے
دنیا کو دیا پیغام سکوں، طوفانوں کے رخ موڑ دیے
اس محسن انسانیت نے کیا کچھ نہ دیا انسانوں کو
دستور دیا منشور دیا کئی راہیں دیں کئی موڑ دیے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اخلاق حسنہ کی دولت سے تڑپتی انسانیت کی غمخواری کی، اپنے ازلی وابدی دشمنوں کو پتھر کے جواب میں پھولوں کا گلدستہ پیش کیا، نفرت کے اندھیروں میں الفت ومحبت کی شمع روشن کی، آپسی تفرقہ بازی اور دائمی بغض وعداوت کی بیخ کنی کرکے بھائی چارہ اور الفت ومحبت کے چشمے بہائے، یہی نہیں بلکہ ذرا دوقدم آگے بڑھ کر فتح مکہ کی تاریخ کے اوراق کو والٹ کر دیکھئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں فاتحانہ انداز میں داخل ہوتے ہیں، صحابہ کرامؓ کی دس ہزار جمعیت آپؐ کے ساتھ ہے، صحابہ اعلان کرتے ہیں الیوم یوم الملحمة آج بدلے کا دن ہے، آج جوش انتقام کو سرد کرنے کا دن ہے، آج شمشیر وسناں کا دن ہے، آج گذشتہ مظالم کے زخموں پر مرہم رکھنے کا دن ہے، آج ہم ان کی کھوپڑیوں کو اپنی تلواروں پر اچھالیں گے، آج ہم شعلہ جوالہ بن کر خرمن کفار کو جلاکر بھسم کردیں گے اور گذشتہ مظالم کی بھڑکتی چنگاری کو ان کے لہو سے بجھائیں گے۔

لیکن تاریخ شاہد ہے اور زمین وآسمان گواہی دیتے ہیں کہ ایسا کچھ نہیں ہوا، رحمت نبویؐ جوش میں آئی اور زبان رسالت کی صدائیں لوگوں کے کانوں سے ٹکراتی ہیں: الیوم یوم المرحمة، لاتثریب علیکم الیوم ،اذھبوا انتم الطلقاء کہ آج تو رحم وکرم کا دن ہے، معافی کا اعلان عام ہے، جاؤ تم سب آزاد ہو، تم لوگوں سے کسی قسم کا بدلہ نہیں لیا جائے گا، یہ تھا آپؐ کا اخلاق کریمانہ، یہ تھا آپؐ کے اخلاق حسنہ کا اعلیٰ نمونہ، جس کی مثال سے دنیا قاصر ہے۔

نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اخلاق حسنہ سے بھری پڑی ہے، جسے آج ہمیں اس نازک ترین حالات میں اپنانے کی ضرورت ہے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اخلاق کی تعلیم دوسروں کو دیں اور خود بھی اس پر عمل پیرا ہوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل پر اپنی زندگی کو سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق حسنہ کو اپنانے کے بعد ہمارے لیے بھی حسن اخلاق کی بلندی پر فائز ہونا آسان ہوجائے گا:

زندگیاں بیت گئیں اور قلم ٹوٹ گئے
تیرے اوصاف کا ایک باب بھی پورا نہ ہوا

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اخلاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اپنانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

☆☆☆☆☆

فقہ وفتاویٰ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

سوال: ایک سرکاری ملازم تھے، انھوں نے اپنی تنخواہ کی رقم سے ایک زمین شہر میں خریدی اور اپنے بڑے بیٹے کے نام مصلحتاً رجسٹری کروائی، مصلحت یہ تھی کہ خاندان مشترک تھا اور اپنے نام کرانے میں یا والد کے نام کرانے میں مشترک ملک ہوجانے کا اندیشہ تھا، مصلحت اسی میں سمجھی کہ اپنے بچہ کے نام کردیا، بعد میں دوسرے بچے بھی پیدا ہوئے، اب بڑے لڑکے کا دعویٰ ہے کہ یہ زمین میری ہے، والد صاحب نے مجھے دی ہے جبکہ والد جو ضعیف ہیں، ان کی صراحت ہے کہ میں نے صرف رجسٹری ان کے نام کی ہے، مالک نہیں بنایا ہے، لڑکا بیع نامہ کی وجہ سے اپنی ملکیت کا دعویٰ کررہا ہے اور والد کا بھی انتقال ہوگیا ہے، کیا اس میں دوسرے وارثین کا حق ہے یا نہیں؟

جواب: بڑے لڑکے کے نام صرف رجسٹری کردینے سے شرعاً ملکیت نہیں ہوتی ہے، جب تک والد دے کر قبضہ نہ کرادے، مذکورہ صورت میں اس زمین میں تمام وارثین کا حق ہے، انہیں چاہیے کہ وہ زمین تمام بھائیوں و بہنوں میں تقسیم کردیں اور نام بھی رجسٹرڈ کرادیں، ورنہ عنداللہ جوابدہ ہونا پڑے گا۔

[فتاویٰ ہندیہ: ج ۴/ص ۳۷۴]

سوال: ایک شخص نے دوسری شادی کی، پہلی بیوی سے اولاد نہیں تھی، دوسری بیوی بیوہ تھی اور پہلے شوہر سے ایک بیٹا تھا، انھوں نے کچھ لوگوں کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ میں اپنا مکان بیوی کے اس بچہ کو دے دوں گا، چند برسوں کے بعد اسی بیوی سے ایک بچہ پیدا ہوا، دونوں بڑے ہوئے، شادیاں کردیں، اب ان سے جو بچہ ہے وہ مکان اور دیگر املاک پر تنہا وارث ہونے کا دعویٰ کررہا ہے، انھوں نے بیوی کے بچہ کے لیے جو وعدہ کیا تھا، اس پر شرمندہ ہیں، اب کیا کریں، اور یہ کہ کچھ نہ دینے پر عنداللہ مواخذہ ہوگا؟

جواب: شخص مذکور کے وارث صرف وہی لڑکے ہیں جوان سے ہیں اور جو بیوی کے بچے سابق شوہر سے ہیں، وہ وارث نہیں ہیں، اس صورت میں اگر وعدہ پورا نہیں کرسکیں تو ان شاءاللہ عنداللہ مواخذہ نہیں ہوگا، البتہ اطمینان اور احسان کی ایک صورت یہ ہے کہ بیوی کے بچہ کے لیے اس مکان کا ایک تہائی حصہ وصیت کردیں تاکہ بعد وفات اس کا نفاذ ہوسکے اس طرح وراثت بھی جاری ہوجائے گی، وارثین کے حق میں حق تلفی بھی نہیں ہوگی اور وصیت بھی نافذ ہوگی جس سے وعدہ بھی پورا ہوگا اور احسان وہمدردی بھی ہوجائے گی۔

[الدر المختار علی رد المحتار: ج ۱۰/ص ۳۳۹]

سوال: ایک شخص نے اپنا مکان دوسرے کو ہبہ کردیا لیکن ہبہ کرنے والا اسی مکان میں رہتا ہے، اس مکان سے اپنا سامان نکالا نہیں ہے، ایسی صورت میں یہ ہبہ کرنا صحیح ہوا یا نہیں؟

جواب: ہبہ مکمل ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس کو ہبہ کیا گیا ہے، اس کے قبضہ میں وہ چیز دیدی جائے، مذکورہ صورت میں چونکہ ہبہ کرنے والے ہی کا قبضہ بدستور باقی ہے، اس لیے یہ ہبہ مکمل نہیں ہوا۔

[الدر المختار مع رد المحتار: ج ۵/ص ۶۹۰]

سوال: جو لوگ اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے ہیں، ان کے یہاں دعوت کھانا اور کچھ تحفہ وہدیہ دیں تو قبول کرنا شرعاً کیسا ہے؟

جواب: جو لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے حالانکہ ان کے ذمہ زکوٰۃ فرض ہے، وہ سخت گنہگار ہیں اور زکوٰۃ ان کے ذمہ دین ہے، قرآن میں صراحت کے ساتھ زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کو سخت وعید سنائی گئی ہے اور حدیث نبویؐ میں بھی سخت سزا کی خبر بتائی گئی ہے۔ [بخاری شریف: ج ۱/ص ۱۸۸، کتاب الزکوٰۃ] مگر اسکی وجہ سے دنیا میں اس کا مال حرام نہیں کہلائے گا، اس لیے ان کے یہاں دعوت کھانا اور ان کی طرف سے دیے ہوئے ہدیے اور تحفے قبول کرنا درست ہے، تاہم بطور زجر قبول نہ کرنا بہتر ہے تاکہ وہ زکوٰۃ ادا نہ کرنے کی حرکت سے باز آجائے۔

[فتاویٰ ہندیہ: ج ۵/ص ۳۴۳]

سوال: غیر مسلم اگر بطور ہدیہ کچھ دیں یا شادی بیاہ کے موقعوں سے دعوت دیں تو ان کے ہدیے قبول کرنا اور دعوتوں میں شرکت کرنا شرعاً کیسا ہے؟

جواب: اگر ہدیہ حلال مال کا ہو، اسی طرح اگر دعوت میں مشرکانہ طریقہ اختیار نہ کیا گیا ہو تو رواداری کے طور پر ہدیہ قبول کرنا اور دعوتوں میں شریک ہونا درست ہے، اسلام میں غیر مسلموں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے اور رواداری کا مطالعہ کرنے میں اجازت ہے اور حسن نیت کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کرنا باعث ثواب بھی ہے۔

[فتح الباری: ج ۵/ص ۵۵۱]

☆☆☆☆☆

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوۃ العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہٖ تعالیٰ

Date ____________ تاریخ ____________

اہل خیر حضرات سے!

اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی و دینی تعلیمی و تربیتی خدمات انجام دے رہا ہے اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لئے ندوۃ العلماء قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانے میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماعیت کی کوشش، فتنہ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور علوم اسلامیہ کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ رمضان المبارک کے موقع پر دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ، سفراء و محصلین آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہو کر صدقات وعطیات کی وصولیابی کا کام انجام دیتے ہیں، لیکن اس وقت پورے ملک میں کورونا وائرس کی وجہ سے لاک ڈاؤن ہے، ایسے حالات میں سفر کرنا دشوار ہے۔ اس لئے آپ کے عطیات کی فراہمی بینک کے ذریعہ ہی بہتر ہے۔

لہٰذا آپ حضرات سے گذارش ہے کہ اپنے صدقات وعطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔ آمین

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(پروفیسر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) سید بلال عبد الحیٔ حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA
STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH, LUCKNOW
(IFSC CODE : SBIN0000125)

عطیات	A/c. No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c. No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c. No. 1086 3759 766

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:
NADWATUL ULAMA
اور اس پتہ پر ارسال کریں
NIZAMAT NADWATUL ULAMA
Nizamat Office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marg, Lukcnow - 226007 (U.P.)
معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر
+91 - 7275265518
پر مطلع فرمانے زحمت کریں، اس سے دفتری کاروائی میں سہولت ہوگی۔
فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا